واصفؔ علی واصفؔ

قطرہ قطرہ قُلزم

KASHIF PUBLICATIONS

جملہ حقوق بحق "کاشف پبلیکیشنز" محفوظ

" کاشف پبلیکیشنز " کی جانب سے تصانیفِ واصفؒ کی اشاعت و تقسیم کی ذمّہ داری

"دَرِ احساس پبلی کیشنز " کو تفویض کی گئی ہے۔

علاوہ ازیں کوئی شخص یا ادارہ قانونی طور پر کتابِ ہذا کی طباعت و تقسیم کا مجاز نہیں!

نام کتاب	:	قطرہ قطرہ قلزم
مصنّف	:	واصف علی واصفؒ
سرورق	:	محمد حنیف رامے
طبع اوّل	:	1989ء
اشاعتِ نَو	:	2024ء
ہدیہ	:	-/800 روپے

دَرِ احساس پبلیکیشنز

509 H2, Johar Town, LHR

اَدب ، دِین اور تصوّف کے موضوعات پر — تمام مکاتبِ فکر کی کتابوں کا مرکز

25/1 بہاولپور روڈ مزنگ لاہور (مزار حضرت واصف علی واصفؒ کے عین سامنے)

0302-0011614 +92 42 3723 2424

@wasifcentre@gmail.com www.dareehsas.com

ڈکان نمبر 7 ، گراؤنڈ فلور، الحمد مارکیٹ، 40 غزنی روڈ، اُردو بازار، لاہور

اُس کے نام—

جس کے سب نام ہیں—

جسے کسی نام کے بغیر بھی—

پُکارا جا سکتا ہے—

یاد کِیا جا سکتا ہے!!

واصؔف مجھے ازل سے ملی منزلِ ابد
ہر دَور پر محیط ہوں جس زاویے میں ہوں

فہرستِ مندرجات

"گر قبول اُفتد"	07	بلا سبب	105
زندگی	13	پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں	109
توبہ	18	گردش تیز ہے ساقی	113
موتی	24	سوال یہ ہے کہ۔۔۔	118
تقرّب الٰہی (1)	30	ہم کیا ہیں؟	123
تقرّب الٰہی (2)	35	عذاب	130
محبوب	40	مصروفیت	135
فراق و وصال	45	منفعت	139
دُکھیا سب سنسار	49	تعریف	144
خوف اور شوق	53	خاموشی	147
بات سے بات	58	پریشانی	152
ظلم	65	مجبوری	157
کرب ہی کرب	69	جمہوریت	162
رفعتِ خیال	73	خطرہ	166
بارِ تسلیم	78	قیادت	171
معمولی بات	82	ذرّے میں صحرا	176
گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات	86	موت کا خوف	180
مذہب	92	عاجزی	184
مفروضے، اندازے اور مجبوریاں	97	لب پہ آ سکتا نہیں	190
ماضی، حال اور مستقبل	100	یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر	197

میرا نام واصفِ باصفا، میرا پیر سیّدِ مرتضیٰؑ
میرا وِرد احمدِ مجتبیٰﷺ، میں سدا بہار کی بات ہوں

"گر قبول اُفتد"

کسی شَے کو چھوٹا سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُسے یا دُور سے دیکھا جائے یا غرور سے دیکھا جائے، ورنہ اگر اُسے قریب سے دیکھا جائے، عزت سے دیکھا جائے تو وہی شے اپنے اندر اِک جہان رکھتی ہے۔ اِک ذرّۂ بے مایہ اپنے اندر سرمایۂ گراں مایہ رکھتا ہے — ذرّے کا دِل چِیر ا گیا تو کتنے آفتاب لرز گئے — اِسی طرح قطرے کے اندر وسعتِ بے کراں ہے — وہ اپنے دِل ہی دِل میں خود کو قلزم ساز سمجھتا ہے، بلکہ قلزم نواز سمجھتا ہے — وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے دَم سے کائنات کی زِندگی ہے — ہر شے کی زِندگی پانی سے ہے اور پانی کی اساس قطرہ ہے — یہ قطرے کا تصوّر ہے، اپنے بارے میں —!

اِسی طرح قلزم خود کو قطروں کا خالق و مالک سمجھتا ہے — وہ چاہے تو قطروں کو جدائی کے سفر پر روانہ کر دے اور چاہے تو اُنہیں وصال کی عطا کے لیے رُوبرو حاضر کر لے — بہر حال یہ قطرے اور قُلزم کا کھیل ہے — اصل اور اوّل کون ہے؟ — وہ، جسے موت نہیں آتی — وہ، جسے تبدیلیاں تبدیل نہیں کر سکتیں — وہ، جسے ہمیشہ ہمیشہ سے قیام ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے — وہ، جسے قابو کرنا، بس میں کرنا، اِختیار میں لانا، مسخّر کرنا ناممکنات میں سے ہے — قُلزم اپنی تنہائیوں اور مستیوں میں حیّ و قیّوم ہے، لیکن قطرہ اپنی تنہا ذات میں بقا حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ قلزم کی پناہ میں ہے، تو ہے، ورنہ اُس کا ہونا ہی نہیں ہو سکتا۔ قلزم آشنا نہ ہو تو قطرہ مرگ آشنا کر دیا جاتا ہے۔ قطرے کی تنہائی اُس کی موت ہے، قلزم سے دُوری اُس کی فنا ہے —

قلزم اُس کی زندگی کا ماخذ ہے اور ماخذ سے کٹ کر زِندگی زندہ نہیں رہ سکتی۔ قطرہ — ہزار شبنم بنے، ہزار آنسو بنے، اشکِ ندامت ہو کہ نوکِ خار پر رقص کرنے والا، قطرہ — اپنے منفرد وجود میں موجود نہیں رہ سکتا — سورج کی چشمِ عنایت سے پہلے ہی شبنم فنا ہو چکی ہوتی ہے — بہر حال قطرہ اگر وصالِ بحر سے محروم ہو تو وہ قطرہ ہی نہیں رہ سکتا — اُس کا وجود جس ذات کا مرہونِ احسان ہے، اُسی کے دَم سے ہی قائم رہ سکتا ہے، نہیں تو نہیں —!

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اگر قطرہ وصالِ بحر حاصل کر لے، تو بھی وہ نہیں رہ سکتا — سمندر میں شامل ہو کر قطرہ، قطرہ تو نہیں رہے گا — سمندر بن جائے — ہزار بار بن جائے — وہ قطرہ نہیں رہے گا — وہ جو تھا — نہ رہا — اب اور کیا بن گیا؟ — سمندر نے قطرے کو ہمکنار کیا، آغوشِ رَحمت میں لے لیا، اُسے وُسعتِ بیکراں عطا کر دی — اُس کا اصل اُس پر آشکار کر دیا، اُس پر ایسا حال طاری کیا کہ اُس کا ماضی اب اُس کا حال ہی نہیں، مُستقبل بھی ہے — اصل سے جدا ہو کر اصل میں ملنا بڑی بات ہے — لیکن فراق میں قائم رہنے والا قطرہ وصال میں بکھر گیا — منتشر ہو گیا — پھیل گیا — سمندر بن گیا — اور یوں اپنی ذات سے فنا ہو کر کسی اور ذات میں بقا پا گیا —!

ہر دو حالت میں قطرہ، قطرہ نہیں رہ سکتا۔ یہ وجود ہمیشہ نہیں رہ سکتا — یہ قلزم کا فیض ہے — وہ فراق عطا کرے تو قطرہ فراق کی آگ میں سلگتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے، اور اگر وہ وِصال عنایت فرمائے تو بھی قطرہ اپنی ذات سے نکل کر ذاتِ محبوب میں گُم ہو جاتا ہے۔ گُم ہو جانا تو قطرے کا مُقدّر رہے ہی سہی — کیوں نہ وہ منزل اور راستے میں گُم ہو — "بے راہ" راستوں میں گُم ہونے والے "دونوں جہاں" میں خسارہ پا گئے۔ خسارہ کیا ہے؟ نفع کیا ہے؟ — یہ بہت لمبی بات ہے — چند روزہ زِندگی میں یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ اصل کیا ہے؟ سُود کیا ہے؟ نفع کیا ہے؟ ضرر کیا ہے یعنی نقصان کیا ہے؟ ہونا کیا ہے؟ نہ ہونا کیا ہے؟ اور کیا ہونا، نہ ہونا بھی ہو سکتا ہے؟ — کیا ہم واقعی ہم ہیں — ہم کب سے ہیں — کب تک ہیں — اور کیوں

ہیں—! کیا "قطرہ" فنا سے ڈر کے بھاگ رہا ہے، یا یہ فنا کے تعاقب میں بھاگ رہا ہے—وہ جو فانی ہُوئے، اُن کو نکال کر "باقی" کی ہستی کیا ہے—اور وہ جو "باقی" سے واصل ہوئے اُن کے بغیر کیا "باقی" کا وجود نہیں رہتا!—سب کچھ، سب کے بغیر رہ سکتا ہے تو یہ سب کچھ کیا ہے—؟

یہی وہ سوال ہے جس کی تلاش میں، سفر کے دوران میں، اِنسان کو نئے سوالات سے آشنائی ہوتی ہے اور پھر نئے جوابات کے حصول کا سفر ایک اور حقیقت سے آشنا کراتا ہے— محدود زندگی میں لامحدود گوشوں کی دریافت اِک عجب حال ہے—اِتنی وسیع و عریض، جمیل و عظیم، ظاہری اور باطنی کائنات کے حَسِین اوراق کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے لیے اِتنے مختصر ایّام—کیا کِیا جائے—نظر محدود ہے اور نظارے لامحدود—!

صاحبانِ فکر و نظر آتے ہیں اور بیان کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں—کائنات جوں کی توں رہتی ہے۔ اِس کے ایک گوشے کے کسی ایک حصے کا بھی بیان مکمل نہیں ہو سکتا—اور ابھی نہ جانے کیا کیا ہے—لکھنے والا—!

اگر سمندر سیاہی بن جائیں اور درخت قلم ہو جائیں تو بھی بیان نہیں کر سکتے، اُس کی شان اور تسبیح جو اصلِ کائنات ہے، مالکِ کائنات ہے، خالقِ کائنات ہے—یہ بیان ممکن ہی نہیں —حُسنِ بیان عطا ہو جائے تو بھی حقِ بیان ممکن نہیں—!

قطرہ اپنے اندر قلزم کا جلوہ دیکھے یا قلزم کے اندر جا کر اپنا جلوہ دیکھے—حقیقتِ حال کو بیان نہیں کر سکتا— قطرہ قطرہ، قلزم ہو جائے تو بھی قلزم بیان میں نہ آئے گا— ہزار مضامین لکھو، بات بیان ہی نہیں ہو پا رہی—ہزارہا لائبریریاں—علم کے چراغ—اخباروں کے کالم—مبلّغین کی خیال آرائیاں—مشائخِ کرام کی طریقتیں اور طور طریقے—سیاستدانوں کی تقریریں اور تحریریں، اور کوششیں —اور نہ جانے کیا کیا— اور پھر حکمرانوں کے احکامات، بس— حکم ہی حکم— یہ سب کوششیں ہیں، حقیقت آشنائی کے انداز— اور پھر حقیقت بیان سے باہر، ہمیشہ ہی بیان سے باہر—وسعتِ بیان مل بھی جائے تو بھی بیانِ وسعت

ممکن نہیں — بس صرف رونق ہے— صرف جلوہ ہے— دیکھنے والا منظر— غور والی بات، حاصل صرف فنا ہے، صرف اور صرف فنا—!

میرے بعد کیا ہو گا— تجھ سے پہلے کیا تھا؟

مَیں اُس کو نہیں مانتا— تجھے کون مانتا ہے ؟

مَیں علم تک پہنچ گیا— جہالت سے کب جدا ہوئے ہو؟

مَیں سب کو فتح کرلوں گا— فتح کرنے کی خواہش ہی کو فتح کرلو؟

مَیں ہمیشہ رہوں گا— کس کے لیے—؟ تم جس کے لیے بھی رہو گے وہ ہمیشہ نہیں رہ سکے گا۔

مَیں کامیابی کا راز جانتا ہُوں— تم سے پہلے جو لوگ یہ راز پا گئے تھے وہ کہاں گئے ؟

بہر حال یہ کہانی ختم نہیں ہو سکتی— نہ کوئی معیار آخری ہے، نہ کوئی اسلوب انتہائی — لائبریری سے باہر بھی علم ہے— اور علم سے باہر بھی علم ہے— ایک جاننے والا دُوسرے جاننے والے سے بے خبر بھی ہو سکتا ہے۔ ہم خود کو معیار سمجھتے ہیں اور دوسروں کو ماپتے رہتے ہیں۔ اُن کی خوبیاں اور خامیاں دریافت کرتے ہیں — ہم خود دوسروں کی زَد میں ہیں — دوسرے اپنا اپنا معیار رکھتے ہیں— کوئی معیار آخری نہیں— کوئی راز اِنتہائی نہیں— یہ سارا منظر موجود "نظر" کا مرہون ہے— آج کی کائنات ہی آج کے اِنسان کی ہے— کائنات اِنسان کی دَسترس میں ابھی آیا چاہتی ہے اور اِنسان کائنات کی گرفت میں آ بھی چکا ہے— قطرہ قلزم کے رُوبرو ہی نہیں، دُوبدو بھی ہے— اور نتیجہ کیا ہو گا، سِوائے اِس بات کے کہ قطرہ، قطرہ نہ رہے گا— قطرے پر لازم ہے کہ وہ اپنی ہستی کے محسن و ماخذ پر نظر رکھے— وہ اپنے محبوب، مونس اور غمگسار مالک سے رابطہ کرے— وہ کائنات اور کائنات کے خالق کو سمجھے۔ وہ اپنے اصل اور اپنے محبوب قلزم کی لگن میں رہے— یہی اُس کی ہستی کی اساس ہے—!

اگر جُز ہی خود شناس ہو جائے تو اُسے کُل شناس بننے میں دیر نہیں لگتی— دِقّت تو

صرف اِس بات کی ہے کہ اِنسان خود شناسی سے گریزاں رہتا ہے۔ وہ کائنات آشنائی کے سفر پر روانہ رہتا ہے اور خود سے نا آشنا، خود سے جدا، خود سے بیگانہ، اپنے آپ سے اجنبی ہی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علوم کی بہتات میں بھی جہالت کی کار فرمائی قائم رہتی ہے — ہم سب کچھ جانتے ہیں، سب کچھ پہچانتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں — ہم کو کس نے اِس جہانِ اجنبی میں نامعلوم مسافتوں پر روانہ کر رکھا ہے — اور پھر ہمیں عین سفر کے دوران اور سفر کے درمیان واپس بُلا لیا جاتا ہے — اگر جانا ہی تھا تو آنا کیا تھا؟

یہی عجب بات ہے — کہ فانی ہی باقی کا آئینہ ہے۔ کرنیں نہ ہوں تو سورج کا جلوہ کیا ہے؟ قدیم کا ذِکر صرف حادث ہی کی زبان سے سنا گیا۔ اِنسان فانی ہے لیکن وہ باقی کی دُھن میں ہے۔ اللہ باقی ہے لیکن وہ فانی ہی کو تخلیق فرماتا ہے، اِسی فانی سے محبّت کرتا ہے، اِسی کے خیال میں رہتا ہے — خالق اور مخلوق دونوں ایک دوسرے کے خیال میں رہتے ہیں — عقل کا حجاب اُٹھ جائے تو جلوہ کچھ اور ہی ہے۔ باقی کی محبّت فانی کیسے ہو سکتی ہے، باقی کا محبوب باقی ہی ہو گا!

بہر حال قُلزم کے جلوے، قطروں کے جلوے ہیں — نقش و نگار کی کثرت، دراصل وحدت ہی کے جلوے ہیں —!

خیال ایک وسیع قلزم ہے، صاحبِ خیال کی تخلیقات قطروں کی طرح ہیں — قطرہ قطرہ تقسیم ہونے کے بعد بھی قلزم تو قلزم ہی رہتا ہے — اُس کی وسعتوں کو کچھ فرق نہیں پڑتا — خیال بیان ہو کر بھی بیان نہیں ہوتا — سمندر سے دس دریا نکال لیے جائیں تو بھی وہ جوں کا توں ہے — اور اگر اُس میں دس دریا شامل کر دیے جائیں تو بھی وہ جوں کا توں ہی رہتا ہے۔ یہ صرف اِحساس کی بات ہے — تسلیم کی بات ہے — ورنہ کہاں قطرہ اور کہاں قلزم — قطرے کا وجود عطائے قلزم ہے اور قلزم کا وجود ماورائے قطرہ ہے —!

مصنّف اپنے مضامین کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ خود ہی اپنی تصنیف کا خالق ہے — دَراصل خیال کا خالق وہی ہے، جو اِنسان کا خالق ہے — خیال جب چاہے، جہاں

سے چاہے نمودار ہو جائے — جس زبان سے چاہے، بیان ہو جائے، جس قلم سے چاہے، رقم ہو جائے — اِس لیے اِن مضامین کو خالقِ خیال کا اِحسان مانتے ہوئے، آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں — وہ چاہے تو صحرا سے چشمے پھوٹیں، وہ چاہے تو بنجر سیراب ہو جائے، وہ چاہے تو تاریکی جگمگانے لگے، وہ چاہے تو اِنسان کو بیان کی دولت عطا ہو جائے — وہ چاہے تو معصیت مغفرت میں بدل جائے — وہ چاہے تو سرنگوں سرفراز ہو جائیں — وہ چاہے تو یہ کتاب اُسی کے نام کر دی جائے — قطرہ اپنی ہستی اور اپنی ہستی کی بے مائیگی کے علاوہ قلزم کو کیا پیش کر سکتا ہے — پس اپنی تخلیق — اپنے خالق کے نام!!

واصفؔ

زندگی

زندگی کسی میدانِ کارزار کا نام نہیں — یہ جلوہ گاہ ہے، حُسن کی جلوہ گاہ — یہ ایک بارونق بازار ہے — جس میں سے خریدار گزرتا ہے — وہ خریداری کرتا ہے اور اُس کا سرمایہ ختم ہو جاتا ہے، اور پھر تعجب ہے کہ اُس کی خریداری بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہے — وہ خالی ہاتھ واپس لوٹتا ہے — رونقِ بازار قائم رہتی ہے — اور خریدار ختم ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کسی اُلجھے ہوئے سوال کا نام نہیں — یہ ایک پُر لطف منظر ہے، ایسا لطیف منظر کہ تبصرے اور تنقید کے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کرتا — یہ ایک دیکھنے والا منظر ہے — ایک سُننے والا نغمہ ہے — ایک سوچنے والا منصوبہ نہیں — ایک مشکل معمّہ نہیں۔ زندگی تو بس زندگی ہی ہے — کسی کا اِحسان ہے — کسی کی دین ہے — کسی اور کا عمل ہے۔

یہ سمندر کی طرح ہے — وسیع و بے پایاں — جس کا صرف ایک ہی کنارہ ہے — ایک ساحل — جہاں رونقیں ہیں — میلے ہیں — چراغاں ہیں — ہجوم ہے — تنہائیاں اور اُداسیاں بھی ہیں — دوسرے کنارے کی کسی کو خبر نہیں — جو لوگ دوسرے کنارے کی خبر لینے گئے ہیں، ابھی تک لوٹے نہیں۔ اِس طرف رنگ ہی رنگ ہیں — نیرنگ ہے اور دوسری طرف بے رنگ — صرف ایک ہی رنگ — کون جانے کہ اِس سمندر میں کیا ہے اور اِس کے پار کیا ہے — یہاں میلہ ہے اور پھر ہر انسان اکیلا ہے۔

زندگی کب سے ہے اور کب تک ہے — کون جانے — اَزل سے اَبد تک یا اَزل سے پہلے اور اَبد کے بعد بھی زندگی ہی ہے — تخلیق ہونے سے پہلے یہ خالق کے اِرادے میں زندہ تھی اور

تکمیل کے بعد یہ خالق کے رُوبرو حاضر کر دی جائے گی — زندگی بہر حال زندگی ہی رہے گی!

زندگی وقت کھاتی ہے — زمانے نگل جاتی ہے — کبھی کبھی صدیاں ہڑپ کر جاتی ہے اور ٹس سے مَس نہیں ہوتی، اور کبھی کبھی ایک لمحے میں کئی انقلابات برپا کر دیتی ہے — بہر حال زندگی، زندگی کے درمیان ہی رہتی ہے، ایسے جیسے یہ اپنے ہی سمندر کا خود ہی ایک جزیرہ ہو۔ زندگی سے پہلے بھی زندگی تھی اور زندگی کے بعد بھی زندگی ہی ہو گی — زندگی مرتی نہیں — مر سکتی نہیں — نہ ہی یہ ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے — زندگی ہمیشہ قائم بھی ہے اور ہمیشہ تبدیل بھی ہوتی رہتی ہے۔

زندگی جہاں پھولنے پھلنے کا نام ہے، وہاں اپنی آگ میں بھی جلنے کا نام ہے — زندگی تخلیق کرتی ہے اور اپنی تخلیق کے مراحل میں تحلیل بھی ہوتی رہتی ہے۔ اِس طرح زندگی ہونے اور نہ ہونے کے درمیان ہی رہتی ہے — جلتی بجھتی زندگی بس اُمّید و یاس میں رہتی ہے — یہ سفید و سیاہ دھاگے سے بُنا ہوا خوبصورت ملبوس ہے — اِس میں بہت کچھ ہے — اِس میں قہقہے بھی ہیں، اور ہچکیاں اور سسکیاں بھی!!

زندگی غریبوں کے کچے گھروندوں میں بھی سرشار رہ سکتی ہے اور اَمیروں کے پکّے محلّات میں بیمار بھی رہ سکتی ہے۔ زندگی اگر چاہے تو گردشِ حالات سے منسوب ہو جاتی ہے اور اگر پسند فرمائے تو گردشِ زمان و مکاں سے بے نیاز ہو کر اپنے لیے نئے جہاں پیدا کرتی رہتی ہے۔

زندگی کسی فارمولے میں مقیّد نہیں ہو سکتی — اِسے کچھ کہہ لیجیے، یہ سنتی ہے، مسکراتی ہے اور کچھ اور ہی رُوپ اختیار کر کے فارمولے سے باہر نکل آتی ہے۔

اگر زندگی کو مسلسل سفر کہا جائے تو مکمل قیام کیا ہے؟

اگر زندگی کو بیداری کہا جائے تو نیند اور غفلت کو کیا کہا جائے؟

اگر زندگی کو محبّت کہہ لیا جائے تو نفرت بھی تو زندگی ہے، بلکہ نفرت زیادہ زندہ ہے — نفرت، غصّہ، حسد، انتقام، زِندگی کو زیادہ متحرک رکھ سکتے ہیں۔ بہر حال محبّت اور نفرت

زندگی ہی کے نام ہیں۔

اگر مذہب کو زندگی مانا جائے تو لا مذہبیت کیا ہے؟

اگر زندگی زمین ہے تو آسمان کیا ہے؟

اگر مخلوق کو زندگی کہا جائے تو مخلوق پیدا کرنے والی ذات کو کیا کہا جائے؟

زندگی کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے—اِسے جاننا اور پہچاننا بھی مشکل ہے—یہ ایک راز ہے—ایسا راز کہ جس نے راز جان لیا وہ مر گیا اور جو نہ جان سکا وہ مارا گیا۔

زندگی تلاش میں ہے—کس کی تلاش؟—زندگی اُسے تلاش کرتی ہے جو زندگی کو تلاش کرتا ہے—زندگی موت کے تعاقب میں ہے اور موت زندگی کے پیچھے آ رہی ہے—دونوں، دونوں کی تلاش میں ہیں۔ جب تک دونوں میں سے ایک ختم نہیں ہوتا یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ یعنی نُور اور ظُلمات کا کھیل—ہونے اور نہ ہونے کا کھیل—ماننے اور نہ ماننے کا کھیل—دن اور رات کا کھیل!

زندگی کے دامن میں بے پناہ اور بے شمار نعمتیں ہیں۔ اِس میں خواہشیں ہیں، حسرتیں ہیں—اُمّیدیں ہیں، مایوسیاں ہیں—صداقتیں ہیں، دھوکے ہیں—میلے ہیں اور تنہائیاں ہیں۔

زندگی سمندر ہے، اپنے بادلوں کو نامعلوم سفر پر روانہ کرنے والا—اُنہیں الوِداع کہنے والا—اور پھر یہی سمندر اپنے مسافروں کو، اپنے دریاؤں کو خوش آمدید کہنے والا بھی ہے۔

زندگی سے زندگی نکل رہی ہے—زندگی میں زندگی شامل ہو رہی ہے—زندگی سے زندگی جُدا ہو رہی ہے، زندگی سے زندگی واصل ہو رہی ہے!

دراصل زندگی تو زندگی ہے—فراق و وصال سے بہت بلند—حاصل و محرومی سے بہت بے نیاز—اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر لیکن غیر متاثر!

زندگی بہت پرانی ہے، بہت قدیم ہے، بہت بوڑھی ہے—لیکن یہی زندگی بہت نئی ہے، بہت جدید ہے اور بہت جوان!

ہر قدیم کبھی جدید تھا اور ہر جدید کبھی قدیم ہو گا۔ یوں یہ زندگی بیک وقت قدیم اور جدید ہے — پُرانے شہر اور نئے انسان — پُرانے انسان اور نئے شہر — آج کا انسان پرانے کھنڈرات میں خوش رہتا ہے — یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ لوگ کون تھے جو اِس کھنڈر میں کبھی آباد تھے — یہ کھنڈر کسی زمانے میں محلّات تھے — نیا انسان پرانی کائنات کو دریافت کرنے نکلا ہے — وہ اِسے ترقی کہتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آج کا انسان آج بھی پُرانی طرز پر پیدا ہوتا ہے — پُرانے مصنّفین کو پڑھتا ہے اور نئے علم کا اظہار کرتا ہے۔ نئی بات کیا ہے — پُرانے چہرے ہیں — پُرانی آنکھیں ہیں — پُرانے آنسو ہیں — وہی کچھ ہے جو تھا — اور پھر نئے انسان کے لیے پُرانی منزل — پُرانے قبرستان — یہ سب باتیں سمجھ میں نہیں آسکتیں — یہ سب زندگی ہے — بارات بھی زندگی اور جنازہ بھی زندگی — سمجھنا مشکل ہے — یہ دُنیا بابل کا گھر — اور وہ دُنیا سسرال — تعجب ہے — چار کہار ڈولی لے چلے — اور چار بھائی جنازہ لے چلے — ایک ہی ہے — سب ایک ہے — سب جلوے زندگی کے ہیں — یہ سب ابواب کتابِ ہستی کے ہیں۔ ابتدا اور انتہا سے بے نیاز — زندگی آغاز سے پہلے بھی تھی اور انجام کے بعد بھی ہو گی — زندگی تو بس زندگی ہے — اِس کا یومِ پیدائش اور اِس کا یومِ وصال کسے معلوم؟

کون جانے کہ یہ لامحدود سفر کہاں سے شروع ہوا اور انجامِ کار کہاں ختم ہو گا — بہر حال زندگی ہمہ حال رواں دواں ہے — دریا کی طرح جو چلتا رہتا ہے — مسلسل — مستقل — نہ کٹتا ہے، نہ رُکتا ہے، نہ بے دَم ہوتا ہے — پہاڑوں کا پیغام ہے جو آبِ رواں کے ذریعے سمندر کے نام کیا گیا ہے — یہ پیغام زندگی ہے — اور اِسے لے جانے والا زندہ رہے گا —!

زندگی اپنی عزّت خود ہے — خود ہی یہ اپنی آبرو خاک میں ملاتی ہے — یہ خود ہی محترم و معزّز ہے — کبھی سرفراز ہے کبھی سرنگوں ہے — زندگی سرد خانوں میں دہکتی ہوئی آگ ہے — نار ہے — اور یہی زندگی اِسی نار میں چھپا ہُوا گلزار ہے۔ یہ معمولی سی بات ہے — زندگی دینے والے کے حوالے سے سمجھ آسکتی ہے — اگر تخلیق خالق سے متعلق ہو تو سلامت

ہے، ورنہ یہی ایک قیامت ہے!

زندگی اپنے ہی پردے میں چھپی ہوتی ہے اور اپنے ہی دروازے پر خود ہی دستک دیتی ہے—اور خود ہی اندر سے جواب دیتی ہے—یہاں کوئی نہیں—اور اگر کسی نظر کا فیض ہو جائے تو خود ہی خود کو آواز دیتی ہے—اندر آ جاؤ—ہم تمہارا انتظار کر رہے ہیں—بس زندگی اپنے رُوبرو ہونے کا نام ہے—اپنے قریب ہونے کا نام—اپنے سے قریب ہونے کا نام—اپنے سے آشنا ہونے کا نام ہے—اپنا ہی نام ہے—میں ہی زندگی ہوں—لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ میں تسلیم کروں کہ "تُو" بھی زندگی ہے اور "وہ" بھی زندگی ہی ہے—سب کا احترام ہی اپنا احترام ہے—سب کی زِندگی ہی اپنی زِندگی ہے!!

توبہ

اگر اِنسان کی اپنی عقل اُس کی اپنی زندگی کو خوشگوار نہ بنا سکے، تو اُسے زعمِ آگہی سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر اپنا گھر اپنے سکون کا باعث نہ ہو، تو توبہ کا وقت ہے۔

اگر اِنسان کو اپنا حال اور حالات درست کرنے کا شعور نہ ہو، تو اسے دانش ور کہلانے سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر مستقبل کا خیال ماضی کی یاد سے پریشان ہو، تو توبہ کر لینا ہی مناسب ہے۔

اگر اِنسان کو تلاش کے باوجود ہمیشہ غلط رہبر یا رہنما ملیں تو اُسے اپنی اِطاعت شعاری کے دعویٰ سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر اِنسان اپنے آپ کو غم، پریشانی، غریبی، غریب الوطنی یا موت سے نہ بچا سکے، تو اُسے اپنے خود مختار ہونے کے بیان سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر اِنسان ایک ہی پتھر سے دو دفعہ ٹھوکر کھائے تو اُسے اپنی صحیح روی کی ضد سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر اِنسان اپنی جوانی اور رُوپ سے پریشان ہو، تو اُسے اپنے بناؤ سنگھار سے توبہ کرنی چاہیے۔

اگر انسان میں اپنی کامیابی کا سُرور ختم ہو جائے اور اِنسان کو یاد آجائے کہ کامیاب ہونے کے لیے اُس نے کتنے جھوٹ بولے، تو اُسے ضرور توبہ کر لینی چاہیے۔

اگر اِنسان کو اپنے خطا کار یا گنہگار ہونے کا احساس ہو جائے، تو اُسے جان لینا چاہیے کہ توبہ کا وقت آ گیا ہے۔

اپنے گناہوں کا اِحساس ہی توبہ کی ابتدا ہے۔ اگر گناہ کا کوئی گواہ نہ ہو تو توبہ تنہائی میں ہونی چاہیے اور اگر گناہ پوری قوم کے سامنے سرزد ہوا ہو تو توبہ بھی پوری قوم کے سامنے ہونی چاہیے۔

در اصل توبہ کا خیال خوش بختی کی علامت ہے۔ جو اپنے گناہ کو گناہ نہ سمجھے، وہ بد قسمت ہے۔ شیطان کو اپنی غلطی پر توبہ کا خیال نہ آیا، ہمیشہ کے لیے لعین و رجیم ہو گیا۔ اِنسان حکم عدولیوں پر توبہ کرتا رہتا ہے اِس لیے اشرف المخلوقات ہے۔ کافر اپنے کُفر کو دِین سمجھتا ہے، اپنی عبرت کو پہنچے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے ضمیر اور اپنے مزاج کے خلاف عمل کرنا گناہ ہے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ گناہ اپنے مزاج کے خلاف عمل کا نام نہیں، اللہ کے حکم کے خلاف عمل کا نام ہے۔

گناہ اخلاقیات کے حوالے سے نہیں، دِین کے حوالے سے ہے۔ اخلاقیات کا دِین اور ہے، دِین کی اخلاقیات اور!

سچ بولنا اخلاقی فریضہ بھی ہے اور دِینی بھی، لیکن دِین نے ایسی صداقتیں بھی بیان کی ہیں جو اخلاقی صداقتوں سے بہت مختلف اور ماوراء ہیں۔ اللہ، فرشتے، رسول، مابعد اور رُوح ایسی صداقتیں ہیں جنہیں اخلاقیات سمجھنے سے قاصر ہے۔ اخلاقیات اِنسانوں کے بنائے ہوئے ضابطۂ حیات کا نام ہے اور دِین اللہ کے عطا کیے ہوئے ضابطۂ حیات کا نام ہے۔ گناہ اللہ کے فرمان سے اِنکار کا نام ہے۔

ایک پیغمبر اور اخلاقی مفکر میں فرق یہی ہے کہ پیغمبر ایک اور دُنیا کی صداقت بھی بیان کرتا ہے، جب کہ مفکر اِسی دُنیا اور اِسی معاشرے کی اِصلاح کی بات کرتا ہے۔ اخلاقیات دِین کا حصہ ہے، لیکن دینیات اخلاقیات سے بہت بلند ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ دینیات

اخلاقیات اور اِلٰہیات کے مجموعے کا نام ہے۔

بہر حال توبہ اپنی پسند اور ناپسند کے حوالے سے نہیں، یہ اللہ کی پسند اور ناپسند کے حوالے سے ہے۔ ہم اُس شے سے توبہ کرتے ہیں جو ہمارے عمل میں اللہ کی ناپسند کا باعث ہو۔ اِس میں بُرائی بھی شامل ہو سکتی ہے اور وہ عبادت بھی جسے ریاکاری کہا جاتا ہے، اور وہ منافقت بھی جسے فیشن کے طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ ہمارا ہر وہ عمل جو اللہ کو ناپسند ہو، گناہ ہے اور ایسے ہر عمل سے توبہ کرنا ہی عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے۔

اللہ اور انسان کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔ خالق اور مخلوق کے درجات کے علاوہ بھی فرق ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے کسی مُلّا کو دنیا کی خدائی دے دی جائے تو وہ اِس دُنیا میں کیا کیا تبدیلیاں کر دے گا۔ کافروں کو نیست و نابود کر دے گا، یہودیوں کو فی النّار کر دے گا، غیر اِسلامی معاشروں کو تباہ کر دے گا، غرضیکہ اِس دنیا کو اپنے جیسا مسلمان کر دے گا۔

یہ انسان کی خدائی ہو گی۔ اللہ کی خدائی وہ ہے، جو ہے۔ اللہ کے ہاں پسندیدہ دِین اِسلام ہی ہے لیکن کافروں کو پیدا کرنا، اُنہیں طاقت اور قوّت دیتے رہنا، مسلمانوں کی جو حالت ہے اُسے خاموشی سے دیکھتے رہنا، اللہ ہی کا کام ہے۔ اِنسان اور خدا کے عمل میں جو فرق ہے اُس پر غور کرنا چاہیے۔ ہماری جو مرضی اللہ کے علاوہ ہے، غلطی ہو سکتی ہے اور اِس غلطی سے توبہ کرنا لازم ہے۔ ہم اپنے لیے ایک زندگی چاہتے ہیں، ایک انداز کی زندگی۔ اللہ ہمارے لیے ایک زندگی چاہتا ہے، ایک اور انداز کی زندگی۔ اگر اِن دونوں میں فرق ہے تو غلطی موجود ہے۔ اللہ کی پسند کے علاوہ کسی انداز کی زندگی کو پسند کرنا گناہ ہے۔ اِس سے توبہ کرنا ضروری ہے۔

پیغمبر خطا سے معصوم ہوتا ہے۔ کسی پیغمبر کا استغفار پڑھنا عجب ہے۔ نئے مقامات حاصل ہونے پر پُرانے مقامات پر استغفار ہے۔ عروج کی منزل استغفار اور الحمد کی منزل ہے۔ نئی بلندی کا شکر — اور پہلے درجے پر استغفار۔ مطلب یہ ہوا کہ ایک مکمل نیک اور وحیِ الٰہی کے مطابق چلنے والی زِندگی کے لیے بھی استغفار کا عمل منشائے الٰہی کے عین مطابق ہے۔ توبہ اللہ کی

رضا کا حصول ہے۔

بار بار غلطی کرنے اور بار بار توبہ کرنے کے بارے میں اکثر پوچھا جاتا ہے۔ اگر انسان کو گناہ سے شرمندگی نہیں تو توبہ سے کیا شرمندگی۔ توبہ کا عمل ترک نہ ہونا چاہیے۔ اگر انسان کو موت آ جائے تو اُسے حالتِ گناہ میں نہ آئے بلکہ حالتِ توبہ میں آئے، اور کچھ خبر نہیں کہ موت کس وقت آ جائے۔

گناہ کا احساس پیدا ہو جائے تو گناہ سے نفرت ضرور پیدا ہو گی، نفرت ہو جائے تو دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم پیدا ہو گا۔ دوبارہ گناہ نہ کرنے کا اِرادہ ہی توبہ ہے۔ اللہ کو گواہ بنا کر اپنی غلطی پر معذرت اور آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ توبہ کہلاتا ہے۔

توبہ منظور ہو جائے تو وہ گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا۔ جب گناہ معاف ہو جائے تو گناہ کی یاد بھی نہیں رہتی۔ اگر اللہ اِحسان فرما دے تو اِنسان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی میں داخل کر دیا جاتا ہے، اُس کی سابقہ بُرائیوں کو اچھائیوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اللہ توبہ کرنے والوں پر بڑا مہربان ہوتا ہے۔ آدمؑ نے توبہ کی، اُنہیں خلافتِ ارضی کا تاج پہنا دیا گیا۔ یونسؑ نے توبہ کی، اُنہیں نجات ملی۔ ہر توبہ کرنے والے کو اللہ نے اپنا قرب عطا فرمایا۔ شرط صرف یہ ہے کہ توبہ صدقِ دل سے کی جائے اور اپنے آپ کو اُس راستے سے الگ کر دیا جائے جس راستے پر غلطی کے دوبارہ ہونے کا اِمکان ہو۔

توبہ کرنے والے کی زندگی تبدیل ہو جاتی ہے۔ اللہ سے توفیق مانگنی چاہیے کہ توبہ سلامت رہے۔ توبہ شکن اِنسان کہیں کا نہیں رہتا۔ وہ اپنی نظروں سے گر جاتا ہے۔ وہ احترام کے تصوّر سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ دُعا سے محروم ہو جاتا ہے۔ وہ عبادت کی افادیّت سے محروم ہو جاتا ہے۔

گناہوں میں سب سے بڑا گناہ توبہ شکنی ہے۔ توبہ شکنی اِنسان کی شخصیت کو اندر سے توڑ پھوڑ دیتی ہے۔ اُس کا ظاہری وجود بے خراش ہو، تب بھی اندر کا وجود قاش قاش ہو

جاتا ہے۔

دراصل گناہ بالعموم اِنسان کو نقصان پہنچانے والا عمل ہوتا ہے۔ انسان نہیں سمجھتا۔ خالق نے جس عمل سے روکا ہے اُس سے رُک جانا ہی سعادت کا ذریعہ ہے۔

اَدب کی دُنیا میں اگر مصنّف ایسی کتاب تحریر کرے جس کے قاری میں گناہ کی رغبت یا میلان پیدا ہو جائے تو ایسی تخلیق گناہ ہی کہلائے گی۔ ایسے گناہ سے توبہ کرنا لازم ہے۔ مصنّف کا عمل تصنیف ہے اور یہ عمل خیر یا شر کے باب میں اپنا انجام ضرور دیکھے گا۔ گناہوں پر اُکسانے والے کا انجام گنہگار کے انجام سے بھی زیادہ خطرناک ہو گا۔ نیکی پر گامزن کرنے کا عمل نیک اعمال میں سب سے زیادہ مستحسن عمل ہے۔ ادیب مر جاتا ہے، ادب زندہ رہتا ہے اور ادب اپنی تاثیر پیدا کرتا رہتا ہے۔

تاثیر پیدا کرنے والا مرنے کے بعد بھی اپنے نامۂ اعمال میں اپنے قاری کی نیکی بدی کے حوالے سے اضافہ کرتا ہے۔ جس نے جتنے زیادہ لوگوں کو نیک بنایا اُسے اُتنا ہی زیادہ اِنعام ملے گا۔

مصنّف کو اپنی گناہ ساز اور گناہ پروَر تصانیف سے توبہ کرنی چاہیے۔ اگر توبہ قبول ہو گئی تو اُسے نیک تصانیف کا شعور عطا ہو گا، جس سے وہ ہر آنے والے دَور سے دُعائیں حاصل کرے گا۔ آنے والے زمانوں کی دُعائیں یا بد دُعائیں جانے والے انسان کے لیے بڑی تاثیر رکھتی ہیں۔

نیّت کا گناہ، نیّت کی توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ عمل کا گناہ، عمل کی توبہ سے دُور ہوتا ہے۔ تحریر کا گناہ، تحریر کی توبہ سے ختم ہو جاتا ہے۔ جس ڈگری کا گناہ ہو گا، اُسی ڈگری کی توبہ چاہیے۔ صاحبِ تاثیر کی تحریر اُس کے نامۂ اعمال میں رکھی جائے گی۔ جس اِنسان کو جو دولت عطا ہوتی ہو، اُس کی باز پُرس ہو گی۔ الفاظ کی دولت حاصل کرنے والوں سے ضرور اِس دولت کے استعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اگر نصیب یاوری کرے تو اپنی تحریر کو اپنی نیکیوں

میں اضافے کے لیے استعمال کر لیا جائے۔ گذشتہ پر توبہ کا مدّعا ہی یہی ہے کہ آئندہ اپنے الفاظ کے استعمال کو اپنے اعمال کے آئینے میں دیکھا جائے۔

اِنسان کا پیشہ سیاست ہو یا وکالت، تعلیم ہو یا کاروبار، الفاظ کا استعمال، عمل کے میزان میں ضرور دیکھا جائے گا۔

جو انسان جتنا مؤثر ہو گا، اُس کا گناہ اُتنا ہی بڑا ہو گا۔ ہم اپنے گناہوں کو اپنے حلقۂ تاثیر میں سند بنا دیتے ہیں اور یوں ہم زیادہ سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگر توبہ برملا نہ ہو تو برملا گناہ معاف نہیں ہوتا۔ جتنے بڑے ہجوم میں جھوٹ بولا گیا ہو، اُتنا بڑا جھوٹ ہوتا ہے اور اُس کے لیے اُتنی ہی بڑی سزا ہے۔ اِس سے نجات کا واحد راستہ یہ ہے کہ اُتنے بڑے ہجوم میں توبہ کی جائے یا آئندہ ہجوم کے سامنے آنے سے توبہ کی جائے۔

موتی

سمندر کی اَتھاہ گہرائیوں میں، بسیط قلزم کی تاریک پہنائیوں میں، سِیپ کے باطن میں، پردوں میں لپٹے ہوئے مخفی خزانے، آب و تاب کے کرشمے، فطرت کے شہکار، اپنی چمک دمک میں مست، دُرِّ نایاب، موتیوں کی موجودگی ایک عجب سربستہ راز ہے۔

موتی کیا ہیں؟ بس ایک جلوۂ مستور کی داستان ہیں۔ اِنسانی آنکھ سے اوجھل، جھلمل کرنے والے، پردے ہی پردے میں پلنے والے، کسی فنکار کی تخلیق کا اِفتخار ہیں۔ سمندر کا باطن اور پھر سِیپ کا باطن اور اُس میں چھپا ہوا خزانہ، گنج ہائے گراں مایہ کا یہ سرمایہ، اِنسانی عقل و خرد کے لیے تحیّر کا مقام ہے۔

یہ کنزِ مخفی جب آشکار ہوتا ہے تو آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ یہ راز جب ظاہر ہوتا ہے، اِس کی قدر دانیاں ہوتی ہیں، اِس کی قیمتیں لگتی ہیں، اِس کی ضرورتیں محسوس ہوتی ہیں اور یہ چھوٹی سی مخلوق اشرف المخلوقات کی دُنیا میں اپنے جلووں کی تابانی سے جگمگاہٹیں پیدا کرتی ہے۔ اِنسان موتیوں کی مالا سے اپنی ہستی دوبالا کرتا ہے۔

فطرت کو موتی پسند ہیں۔ یہ بڑے مقام کی تخلیق ہے۔ اللہ کریم نے بہشت میں رہنے والی حُور کے حُسن کو ایسے بیان فرمایا کہ جیسے خیمے میں مقصور موتی ہوں۔ دُرِّ مکنون — چھپے ہوئے موتی، سِیپ کے باطن میں، پردے کے اندر موتی، آبدار اور تابدار موتی، اِنسانی آنکھ اور اِنسانی لمس سے دُور، اپنی پاکیزگی کی چادر میں لپٹی ہوئی حُور، اِتنی پاکیزہ اور منزّہ، جیسے یاقوت اور مرجان!

بیانِ حُسن اور یہ حُسنِ بیان، اللہ اللہ! یہ اللہ ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔ اللہ کو موتی پسند

ہیں۔ موتی سے تشبیہ اِلہامی تشبیہ ہے۔ جس شے کو اِنسانی ہاتھ کے لمس کا تجربہ بھی نہ ہو، اِنسانی آنکھ، اِنسان کی نظر سے بھی جس کا جمال آزاد ہو، وہ موتی کیا موتی ہو گا۔ جس طرح سمندر موتیوں کے سرمائے سے مالا مال ہے، اِسی طرح بہشت دمکتے ہوئے لُولُوؤں سے جگمگاتی ہے۔ خیموں میں چھپے ہوئے خزانے، انمول موتی، دُرِّ ثمین، ایک رازِ سربستہ، تخلیق کا شہکار، فنکار کا نقش، فنکار کا نقشِ افتخار — موتی ہی موتی، بہشت دَر بہشت، سُچے موتی کی لڑیاں، خیام میں قیام کرنے والے انعام و اکرام کے گنجینے — اِنسان کون کون سی نعمت کا شکر ادا کرے، کس کس خزانے کا انکار کرے، کس کس رحمت کو جھٹلائے۔ رحمتیں ہی رحمتیں ہیں، نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، برکتیں ہی برکتیں ہیں۔ موتی فطرت کا پسندیدہ استعارہ ہے۔ یہ اِشارہ ہے، مومنوں کے لیے منتظر رحمت کا!!

یہ کائنات موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ سمندر کے اندر موتی، سمندر کے باہر موتی — بادلوں کی جھڑیاں، سُچّے موتیوں کی لڑیاں برستی ہیں۔ موتی برستے ہیں۔ آسمانوں سے موتیوں کی بارش ہوتی ہے — خزانے ہیں، زمین کے لیے۔ زمین کی پیاس بجھانے والے موتی، زمین کو دولت بخشنے والے، زمین سے خزانے بنانے والے، زمین کو ربوبیت بخشنے والے، رَب کے بنائے ہوئے، بادلوں کے برسائے ہوئے موتی — جھلمل کرنے والے قطرے، مقطّر، منزّہ، پاکیزہ موتی — جَل تھَل کر دینے والے! کیا کیا نعمتیں ہیں، کیا کیا برکتیں ہیں! — موتی ہی موتی، خزانے ہی خزانے!!

سمندر میں موتی، زمین پر بارش کے موتی اور پھر شبنم کے پاکیزہ گوہر — غنچے کو پھول کر دینے والے معصوم قطرے، کتنے خوبصورت ہیں! پُراسرار خزانے ہیں، کتنے سربستہ راز ہیں! کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے اَوس — شبنم — اِنسان کے لیے، اِنسان کی صحت کے لیے آسمانی انعام، موتیوں کا چھڑکاؤ۔ شبنم بڑا راز ہے، رات کا اعجاز، رات کے آنسو۔ گُل کھِل اُٹھتے ہیں، دِل کھِل جاتے ہیں — گُلوں کو رنگ اور رنگوں کو خوشبو عطا کرنے والی شبنم ایک دولت ہے، موتیوں

جیسی خوبصورت اور موتیوں جیسی قیمتی — فطرت کا عطیہ، مفت حاصل ہونے والا خزانہ، مخفی خزانہ — کس کس نعمت کو جھٹلایا جائے — اللہ کی دین ہے!

سمندر میں موتی، زمین پر موتی، ہوا اور فضا میں موتی — اور آسمان — آسمان تو موتیوں سے جھلملاتا ہے۔ چمکنے والے ننھے ستارے، دمکنے والے موتی، دُور سے نظر آنے والے رازہائے سربستہ — کائنات کی لامحدود وسعتوں میں جگمگاہٹیں ستاروں کے دَم سے ہیں — اللہ کریم نے ستاروں کو روشن شمعیں کہا ہے — اِستعارہ دَر اِستعارہ۔ ”ہم نے آسمانوں کو مصابیح سے سجایا“ — سبحان اللہ! آسمان کی چادر کو موتیوں نے زِینت بخشی۔ پاکیزہ موتی، سربستہ موتی، فطرت کے شہکار موتی، تخلیق کا افتخار موتی — کیا کیا نقشے ہیں، کیا کیا جلوے ہیں، کیا کیا رعنائیاں ہیں۔ ستارے ہیں کہ بس جھلملاتے نظارے ہیں — موتی ہی موتی — موتیوں کی لڑیاں — حُسن وخوبی سے فطرت نے جڑاؤ کیا ہے۔ اِنسان غور کرے — سائنس اپنا کام کرے، محبّت والے اپنا کام کریں —! نگاہ کو جلوہ درکار ہے اور جلوے سُچّے موتی ہیں، ہر طرف بکھرے ہُوئے، خزانہ دَر خزانہ، حُسن دَر حُسن، لُطف دَر لُطف —!

موتیوں کے ذِکر میں اُن موتیوں کا ذکر کیسے نہ آئے جو رات کے خاموش آنگن میں دَرد والے دِل کی سِیپ کے باطن سے ظہور کرتے ہیں اور اِنسان کی آنکھ سے ٹپکتے ہیں۔ یہ آسمانِ فکر کے ستارے ہیں کہ اندر کی آگ کے انگارے ہیں۔ آنسو کیا ہیں؟ بس موتی ہیں — چمکنے والے، بہنے والے، گرم آنسو — فریاد کی زبان ہیں۔ پُرانی یادوں کے ترجمان ہیں — یہ آنسو، انمول خزانہ ہیں، معصوم و پاکیزہ — مستور دوشیزہ کے حُسن سے زیادہ حسین، حُور سے زیادہ مکنون، اور یہ خزانہ کمزور کی قوت ہے — دِل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلنے والا آبِ حیات کا چشمہ، سعادتوں کا سرچشمہ، آرزوؤں کے صحرا میں نخلستانوں کا مژدہ۔ آنسو — تنہائیوں کا ساتھی، دعاؤں کی قبولیت کی نوید، اِنسان کے پاس ایسی متاعِ بے بہا ہے، جو اُسے دیدہ وری کی منزل عطا کرتی ہے۔

یہ موتی بڑے انمول ہیں۔ یہ خزانہ بڑا اگراں مایہ ہے۔ یہ تحفہ فطرت کا نادر عطیہ ہے — تقربِ الٰہی کے راستوں پر چراغاں کرنے والے موتی اِنسان کے آنسو ہیں۔ اِن ستاروں، چراغوں، موتیوں کی قیمت یہ ہے کہ اِن کی خریدار خود رحمتِ پروردگار ہے۔ جس کی رات اَشکوں سے منوّر ہے، اُس کا نصیب درخشندہ ہے۔ اُس کا مستقبل خود شناسی اور خود آگہی کا حقدار ہے۔ یہ موتی کبھی رائیگاں نہیں جاتے۔ یہ وہ دولت ہے جس سے وہ بھی نا آشنا ہے جس نے یہ دَرد عطا کیا ہو۔ یہ حسّاس روحوں کا مقدّر ہے — چشمِ تر بذاتِ خود شعر تر ہے۔ اِس دُنیا میں کسی اور دُنیا کے سفیر اِنسان کے آنسو ہیں۔ سوزِ نَفَس کا آہنگِ دلخراش آنسوؤں سے فاش ہوتا ہے۔ اِنسان کے آنسو اُس کے لیے اِدراک کی وسعتیں لکھتے ہیں۔ رُوح کی زبان آنسو ہیں۔ رُوح کی نَوا اَشکِ سحر ہے۔ رُوح کی پرواز کو آنسو ہی توانائی عطا کرتے ہیں۔

خِرد کی بے مائیگی کو سرمایۂ جنوں عطا کرنے والا فرشتہ آنسوؤں کے ساتھ نازل ہوتا ہے۔ آہِ سحر گاہی آہِ رَسا کا دوسرا نام ہے۔ آنسو خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہنے دیتے۔ یہ وہ موتی ہیں جو اِنسان کو اُس کے اپنے باطن سے آشنا کرتے ہیں۔ چشمِ گوہر بار عنایتِ پروردگار ہے۔

دُنیا کے عظیم اِنسان نالۂ نیم شب کی داستان ہیں۔ رازہائے سربستہ آشکار ہو ہی نہیں سکتے جب تک آنکھ اشکبار نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ ایک بہت پُرانے زمانے میں ایک گرو نے اپنے چیلے کو جڑی بوٹیوں کا رَس اکٹھا کرنے کا حکم دیا — چیلے نے عمر بھر جواہر العقاقیر اکٹھا کیا۔ وہ خوشی خوشی اپنے گُرو کے پاس خزانے سے بھری ہوئی شیشی لے کے چلا۔ اُسے ٹھوکر سی لگی اور اُس کے ہاتھ سے شیشی گر کے چکنا چور ہو گئی — وہ تڑپا — پھڑکا اور لگا رونے اور پکارنے: ”اے میرے گرو! میں برباد ہو گیا۔ میری کمائی لُٹ گئی۔ میرا حاصل لاحاصل ہو گیا — اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اب میں دوبارہ کیسے جتن کروں۔ میرے گرو! میں مر گیا، میں تباہ ہو گیا، میری دولت مٹی میں مل گئی“۔

اُس کا گُرو سنتا رہا اور پھر اُس نے خوشی سے قہقہہ لگایا۔ چیلے نے کہا: ”گرو! میں مر رہا ہوں اور آپ ہنس رہے ہیں“۔ گرو نے کہا: ”تم سمجھ رہے ہو، تم لُٹ گئے، میں جانتا ہوں کہ آج تجھے وہ دولت مل گئی جس سے بوٹیوں میں رَس پیدا ہوتا ہے۔ خزانہ گم نہیں ہوا، خزانہ مل گیا ہے“۔ چیلے نے پوچھا: ”کون سا خزانہ؟“ گرو نے کہا: ”تیرے آنسو—یہ آنسو نہ ہوں تو دُنیا میں ویرانی آجائے۔ میرے چیلے! تجھے مبارک ہو! اب من کی چِنتا سے آزاد ہو جا—اِس دُنیا میں دِل کی بوٹی کا اَمرت رَس حاصل کرنا ہوتا ہے، یعنی آنسو—آج تُو سرفراز ہے—یہ تیرے من کے مندر کی مورتی کا دَرشن ہے“۔

بہر حال اِنسان کے آنسو حصولِ رحمت کا قوی ذریعہ ہے۔ آنسوؤں کی فریاد مقبول ہے۔ نالۂ نیم شب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقبول ہے۔ بارگاہِ صمدیت میں آنسوؤں کی درخواست رَدّ نہیں ہوتی۔ آنسوؤں سے زمانے بدلتے ہیں، مقدّر بدلتے ہیں، نوِشتے بدلتے ہیں۔ حوادث کے طوفانوں کے رُخ پھر جاتے ہیں۔ گردشِ ایّام کے طَور بدل جاتے ہیں۔ معصیّت کو مغفرت مل جاتی ہے۔ بدحال ماضی کو خوشحال مستقبل مل جاتا ہے۔ گمشدہ برآمد ہو جاتا ہے۔ بھٹکے ہوئے راہی صاحبانِ منزل بن جاتے ہیں۔ گرداب میں گھرے ہُوئے سفینے ساحلِ مراد تک آتے ہیں—فراقِ مجاز وصالِ حق بن جاتا ہے۔ اَشکوں کے موتیوں کی مالا عالمِ بالا تک کی خبر لاتی ہے—یہ سُچّے موتی، گوہرہائے تابندہ، اِنسان کو—مایوس اور مرے ہُوئے اِنسان کو—زِندہ کر جاتے ہیں۔

جو فریاد لبِ اظہار تک نہ آسکے، وہ اَشکوں میں بیان ہوتی ہے۔ مذہب، رنگ اور نسل سے آزاد ہر اِنسان کی آنکھ میں ایک جیسے آنسو ہوتے ہیں۔ یہی اِنسان کا اِنسان سے واحد رشتہ ہے—ہمدردی کا، غمگساری کا—!

عشق کے مسافروں کا زادِ راہ آنسو ہیں۔ عشق، حقیقی ہو یا مجازی، آنسوؤں سے عبارت ہے۔ روضۂ رسول ﷺ پر حاضری دینے والے آنسوؤں کی زبان سمجھتے ہیں۔ یہ سرمایہ کسی کا

اِحسان ہے، کسی کی دین ہے، کسی کا اعجاز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دریاؤں کو پہاڑوں کے آنسو فرمایا— بے اَشک آنکھ کو پتھر کہا۔ پتھر دل، پتھر نصیب—!

ہم اپنے اللہ کے سامنے کیا پیش کریں۔ نامۂ اعمال تو پیش کرنے کے قابل نہ رہا، دفترِ عمل میں کیا دَھرا ہے۔ رہی عبادت، منظور ہو کہ نہ ہو، کیا کہہ سکتے ہیں—اِبلیس کی کروڑوں سال کی عبادت ایک انکار سے رائیگاں ہو گئی—ہم تو کتنے احکامات سے رُوگردانیاں کرتے ہیں، مَن مانیاں کرتے ہیں۔ ہم نادان اِنسان، کیا پیش کریں—ٹُوٹے ہوئے دِل اور بہتے ہوئے اَشکوں کے ساتھ ہم اُس کے سامنے سربسجود ہیں کہ اے اللہ! یہ حقیر سرمایہ ہی ہم اِس زِندگی سے حاصل کر سکے ہیں۔ یہ ندامت اور شرمساری کے نذرانے تیرے سامنے حاضر ہیں—قبول فرما — اپنی بارگاہِ بے نیازی میں۔ اپنی شانِ غفّاری دِکھا اور ہمارے اَشکوں کو پذیرائی عطا فرمااور ہماری ملّی اور انفرادی لغزشوں کو درگزر فرما اور عطا کر ہمیں اسلاف کا سوزِدروں اور جذبۂ صداقت۔ ہماری اِلتجا اور فریاد اور مُدعا صرف یہی ہے کہ ہمارے اِن موتیوں کو اپنی شانِ کریمی کی تابداری عطا فرما—تُو جانتا ہے کہ ہم بے کس و بے بس ہیں — تیرے حبیب ﷺ کے نام لیوا ہیں، اور ہماری بساط کیا ہے—قبول فرمالے مولا! ہماری فریاد جو صرف آنسوؤں کی زبان میں ہم بیان کرتے ہیں۔ تُو اور تُو ہی ہمارے آنسوؤں کا آخری سہارا ہے — تُو قبول کر لے تو یہ موتی انمول ہیں۔ تجھے موتی پسند ہیں—ہم تیری بارگاہ میں یہ موتی پیش کرتے ہیں۔ تجھے دُرِّ یتیمؐ اور دُرِّ نجفؑ کا واسطہ، ہمارے موتی قبول فرما!

۩۩۩

تقرّبِ الٰہی (۱)

ہر مُقرّب جانتا ہے کہ تقرّبِ الٰہی کی منزل ایک لا محدود سفر ہی کا نام ہے۔ اگر تقرّبِ اِلٰہی کسی مقام کا نام ہے تو یہ مقام بذاتِ خود سفر میں ہے۔ خالق کے ساتھ مخلوق کا قرب کسی فارمولے کا محتاج نہیں۔ ویسے تو ہر مخلوق اپنے خالق سے متعلّق رہتی ہے لیکن مُقرّب کا درجہ اُس کے اپنے فضل ہی کا نام ہے۔ آج تک کوئی اِنسان یہ نہیں بتا سکا کہ وہ کون سی صفات یا کون سی صفت ہے جو انسان کو پیغمبر بنا دیتی ہے۔ ہر پیغمبر صاحبِ صفات ہے، معصوم عنِ الخطا ہے، لیکن اُس کا پیغمبر ہونا کسی صفت یا صفات کا نتیجہ نہیں بلکہ صفت یا صفات کا ہونا، اُس کے پیغمبر ہونے کا نتیجہ ضرور ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ مقرّب ہونے کے لیے صفات کا ہونا لازمی تو ہے، لیکن کافی نہیں۔

کسی پیغمبر کے ماننے والے میں اُس پیغمبر کی صفات ہو سکتی ہیں لیکن اُن صفات کے باوجود صاحبِ مرتبہ، کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ مُقرّب کا تقرر ذاتِ حق کے اپنے فیصلے کا نام ہے۔ اِس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ اللہ کریم کسی کافر یا باغی کو مُقرّب بناتا ہے—بالکل نہیں۔ اللہ کسی کافر کو اگر مُقرّب بنانا چاہے تو اُسے پہلے ایمان کی دولت عطا فرماتا ہے۔ یہی راز ہے کہ کسی کافر کے لیے تو دوزخ کا عذاب ہے، اللہ سے دُوری ہے، اور کسی کافر کے لیے ایمان کا سرمایہ ہے، تقرّب کی منازل ہیں، سابقون کے درجے ہیں۔ اِسی طرح جو معاشرہ اِخلاقی طور پر اِنحطاط پذیر ہو، باغی ہو، اُسے بالعموم تباہ کر دیا جاتا ہے، لیکن اِسلام سے قبل عرب کا معاشرہ ہر برائی رکھتا تھا، تباہ ہونے کے قابل تھا لیکن اللہ نے اپنے فضلِ بے پایاں سے اُسے اپنی رحمت عطا کر

دی، بلکہ رحمۃ للعالمین ﷺ عطا فرما دیے۔ باغی معاشرے پر اللہ کی رحمتوں کی بارش، دُور رہنے والوں کو تقرّب کے مژدے، بدنصیبوں کو خوش نصیبی کی خلعت —اُس کے کام وہی جانتا ہے۔ تقرّب حاصل کرنے کا عمل کوئی عمل نہیں، یہ فضل کا مقام ہے، اُس کی رضا کی بات ہے، اور اُس کی رضا کی بس کیا بات ہے— جو چاہے کرے، جیسے کرے، خالقِ مُطلق۔ وہ کسی کے آگے جواب دہ تو نہیں—!

وہ چاہے تو کسی کو ظلمات سے نکال کر نُور میں داخل کر دے، چاہے تو اُس کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے —اور کبھی کبھی شانِ بے نیازی، کسی کے اعمال یکسر ضائع کر دے۔ اِبلیس حکم عدولی کرے تو اُسے ہمیشہ کے لیے لعین و رجیم قرار دیا جائے۔ آدمؑ کسی حکم کے پابند نہ رہ سکیں تو اُنہیں خلافتِ اَرضی کے سفر پر روانہ فرما دیا جائے۔ تقرّب کی منزل عجب منزل ہے۔ تقرّبِ الٰہی کے جلوے نارِ نمرود میں بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ مصر کے بازار میں بِکنے والے غلام کو ایسا مُقرّب بنا دیا جاتا ہے کہ اُس کا قِصّہ اَحسنُ القَصَص بن کر رہ جاتا ہے۔ تقرّب کی داستان کربلاؤں کا سفر طے کر سکتی ہے۔ تقرّب کا فارمولا شہید کے خون سے لکھا جاتا ہے۔ یتیم کے فاقوں سے تقرّب کے نسخے مرتب ہو سکتے ہیں۔

ہر ماننے والے مومن کے دِل میں تقرّبِ الٰہی کی خواہش موجود رہتی ہے۔ اِنسان عبادت کرتا ہے، اُس کے حکم کی اطاعت کرتا ہے، اُس کے قرب کی آرزو کرتا ہے، لیکن ہر مومن یکساں طور پر مُقرّب نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اللہ خود ہی اولیاء اللہ کے نام سے منسوب کرتا ہے۔ اُن کے لیے خوف اور حُزن کی سختیاں ختم کر دی جاتی ہیں۔ کچھ مومنوں پر گردشِ زمان و مکاں کی منزل مسلّط ہو جاتی ہے۔ وہ مومن ہیں لیکن مصائب و آلام میں گھِرے ہوئے۔ اُن کے دل میں ایمان کا چراغ روشن رہتا ہے لیکن حالات کے تیز طوفان اُن پر حملہ آور رہتے ہیں۔ غریب کا یقین قائم رہے تو وہ مُقرّب ہو سکتا ہے لیکن کبھی کبھی غریب اپنی غریبی سے اتنا مغلوب الحال ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے بھی مایوس ہو جاتا ہے۔ غریبی اِنسان کو جہاں قریب کرتی ہے، وہاں اللہ سے دُور بھی کر دیتی ہے۔

ایک مُقرّب کا حال کسی دوسرے پر کم ہی عیاں ہوتا ہے۔ تقرّب ایک رمز کی طرح ہے جو محبّ اور محبوب میں ہوتی ہے۔ ایک مُقرّب کا مرتبہ دوسرے مُقرّب سے بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی مُقرّب اپنے تقرّب سے خود بھی نا آشنا ہو سکتا ہے۔

اِنسان جب تقرّبِ الٰہی کی منزل پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کے لیے یہ بھی تقرّب کی دلیل ہے کہ وہ تقرّب کی تلاش میں نکلا ہے۔ تقرّب کا متلاشی اپنے آپ کا جائزہ لے تو اُسے معلوم ہو گا کہ اُس کے وجود کے کسی نہ کسی حِصے میں تقرّب کی تڑپ موجود ہے۔ وہ تڑپ ہی اُس کے لیے تقرّب کے راز فاش کرتی ہے۔ اگر اِنسان کی پیشانی میں تڑپ ہو تو اُسے اللہ کا قرب سجدۂ شوق میں میسّر آئے گا۔ جبینِ شوق جب سجدوں سے سرفراز ہوتی ہے، اِنسان تقرّب کی منزل طے کرتا ہے۔ ہر طالب کی جبینِ نیاز میں سجدوں کی تڑپ نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ اپنے مالک کا قرب اپنی مشتاق نگاہی سے تلاش کرتے ہیں۔ وہ کاسۂ چشمِ تمنّا لے کر نکلتے ہیں اور نظاروں میں اپنے مالک کی جلوہ گری سے لطف اندوز ہو کر تقرّب کے مدارج طے کرتے ہیں۔ حُسنِ حقیقی کی جلوہ گاہ میں محویت کے مقام سے اُن کا سفر اِلی اللہ شروع ہوتا ہے۔ دراصل سفر اِلی اللہ ہی سفر مع اللہ ہے۔ ایسے مُقرّبوں کے لیے محبوب کا چہرہ خانۂ کعبہ سے کم نہیں۔ دیدارِ حُسنِ یار ہی اُن کے لیے تقرّبِ پروردگار کا سا درجہ رکھتا ہے۔ عشقِ محبوبؐ اگر اُن کی نماز کا امام نہ ہو تو وہ اپنی عبادت کو حجاب سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جو یہاں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہو گا۔ محرومِ دیدارِ حقیقت کو اندھا کہا گیا ہے۔

جس متلاشی کی سماعت بے تاب ہو، اُسے جلوۂ حق کسی نغمے میں محسوس ہو گا۔ گوشِ مشتاق اُس نغمے سے بھی آشنا ہوتا ہے جو ابھی ساز میں ہو—یہی وہ مُقرّب ہیں جو ہر نغمے کو آوازِ دوست سمجھتے ہیں اور برحق سمجھتے ہیں۔

تقرّبِ الٰہی کو اپنی عقل سے تلاش کرنے والا ایک لمبے سفر کا مسافر ہوتا ہے۔ وہ سوال و جواب کی کٹھن راہوں سے مالک کا قُرب حاصل کرتا ہے۔ وہ وجوہات اور نتائج کی کڑیاں ملاتا ہوا سببِ اُولیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ دریافت کر لیتا ہے کہ یہ کائنات، وسیع و عریض کائنات، عبث

نہیں بنائی گئی۔ اِس کا بنانے والا ضرور ہے اور وہی فاطرِ حقیقی اُن کی تلاش کا مدّعا ہوتا ہے۔ صاحبِ عقل پر جب اَسرار فاش ہوتے ہیں تو وہ عالمِ تحیرّ میں پہنچ کر مُقرّب کا درجہ پالیتا ہے۔ اُس کی عقل، عقلِ سلیم بن جاتی ہے۔ وہ آخری سوال کا آخری جواب دریافت کرلیتا ہے۔ یہی تقرّب کی منزل ہے— کٹھن ہے، لیکن ہے! تقرّبِ الٰہی کے مختلف ذرائع اپنی اپنی جگہ پر مستند و معتبر ہیں، لیکن تقرّبِ الٰہی کا آسان ترین راستہ کسی کے فیضِ نظر سے ملتا ہے۔ جلال الدّین رومیؒ کو مولانا رومؒ بنانے والی نگاہ تبریزؒ کی نگاہ ہے۔ رہبرِ کامل اپنے مرید باصفا پر رازِ حقیقت آشکار کرتا ہے اور اُسے تقرّبِ الٰہی کی منزلیں عطا کر دیتا ہے۔ اِسی لیے پیرِ کامل کو کبھی کبھی صورتِ ظِلِّ اِلٰہ کہا جاتا ہے۔ اُس کی طرف چلنے والوں کو جب وسیلہ ملتا ہے، وہ آسودۂ منزل ہو جاتے ہیں۔ رہبر طالب کے دِل میں محبّت کے چراغ روشن کر کے اُسے اطاعت اور عبادت کی اصلیت سے متعارف کراتا ہے اور یوں طالب تقرّبِ الٰہی کی خلعت سے سرفراز ہوتا ہے۔

مُقرّبینِ حق کی شناخت کے لیے بھی کوئی فارمولا نہیں۔ وہ لوگ عام طالبین سے مختلف ضرور ہوتے ہیں۔ وہ عبادت تو خیر کرتے ہی ہیں، عبادت کے ساتھ محبّت بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب آقا کے کسی فعل پر کوئی تنقید نہیں کرتے۔ اُنہیں مخلوق سے بھی کوئی گلہ نہیں ہوتا۔ وہ حاصل کی بجائے ایثار کو اپنا شعار بناتے ہیں۔

وہ محبوب کے ہر ستم کو کرم ہی سمجھتے ہیں۔ وہ جلووں کے متلاشی اور پیاسے ہوتے ہیں۔ وہ حیرت کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اُنہیں ہر طرف حُسن و جمال ہی نظر آتا ہے۔ مُقرّبین غصّہ، حسد، کینہ، لالچ اور نفرت سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے بے ضرر ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ سب کے لیے منفعت بخش ہوتے ہیں۔ وہ کسی کا دِل نہیں دُکھاتے۔ کسی کا حق نہیں رکھتے۔ کسی کو اپنے سے کم تر نہیں سمجھتے۔ وہ گناہ سے نفرت ضرور کرتے ہیں لیکن گناہ گار سے نہیں۔ کسی کی تباہی کی دعا نہیں مانگتے۔ وہ دُنیا کی محبّت سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ شہرت، مرتبے اور دولت کے حجابات سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ وہ نیند پر بیداری کو ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کا سرمایہ عشرتِ پرویز کی بجائے غمِ فرہاد ہے۔ وہ قطرے میں

سمندر کی جلوہ گری دیکھتے ہیں۔ وہ ہر اِبتلا میں بھی ثنا کرتے ہیں۔ وہ صابر ہیں، شاکر ہیں۔ وہ احسان و عدل کے مقامات سے آشنا کر دیے جاتے ہیں۔ وہ ہجوم میں بھی ہوں تو اکیلے ہیں۔ تنہا بھی ہوں تو اُن کے پاس ہجومِ خیال کے میلے ہیں۔ مُقرّبین، بس مُقرّبین ہیں۔ اُن کی شناخت کا کوئی فارمولا نہیں۔

اللہ کی رحمت سب کے لیے ہے، سب کے انتظار میں ہے، کوئی طالب دستک تو دے، دروازہ ضرور کھلے گا۔

بہر حال خالق کے تقرّب کی راہیں خالق کی ذات کی طرح لامحدود ہیں۔ تقرّبِ الٰہی کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ خدمتِ خَلق ہے۔ جب تک انسان مُقرّب نہ ہو، مخلوقِ خدا کے قریب نہیں جا سکتا۔ ہر مُقرّبِ الٰہی مخلوق کا خادم و محسن ہو گا۔

جو اِنسان سب سے زیادہ مُقرّبِ الٰہی ہے، وہی اِنسان تمام مخلوق کے لیے رحمتِ مجسّم ہے۔ رَبّ العالمین کے عظیم مُقرّب رحمۃ للعالمین ﷺ ہیں۔ آپ ﷺ ایک طرف تو اللہ کے انتہائی قریب ہیں اور دوسری طرف مخلوق کے لیے انتہائی شفیق ہیں۔ اللہ کریم نے خود حضورِ اکرم ﷺ کے لیے رؤف اور رحیم کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ آپ ﷺ کا تقرّب سب سے زیادہ — اِس حد تک کہ دُنیا کے تمام مُقرّبوں کو اِسی دَر سے تقرّبِ الٰہی کا شعور عطا ہوتا ہے۔ جس پر حضور ﷺ مہربان ہوں، اُسے تقرّبِ الٰہی کی منزلیں میسر آتی ہیں، اور جس پر اللہ مہربان ہو، اُسے عشقِ نبی ﷺ کی دولت و سعادت عطا ہوتی ہے۔ تقرّبِ الٰہی دراصل تقرّبِ محبوبؐ خدا ہے۔ جو شخص حضور ﷺ کے قریب ہو، وہ اللہ کے قریب، اور جو حضور ﷺ سے دُور، وہ تقرّبِ الٰہی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم۔ جس پر عشقِ مصطفٰے ﷺ بند، اُس پر تقرّبِ خدا بند!!

تقرّبِ الٰہی (۲)

عجب بات تو یہ ہے کہ اللہ کے مُقرّب، اِنسانوں کے قریب رہتے ہیں۔ کہیں اِنسان کا قُرب ہی اللہ کا قُرب نہ ہو! وہ جو صرف اللہ کے قریب تھا اور انسان کے قریب ہونے سے منکر ہُوا، اُس کا حشر تو سب کو معلوم ہی ہے۔

اللہ سے پیار کرنے والے، اللہ کے کام سے پیار کرتے ہیں۔ خالق کی عزّت کرنے والے، خالق کا ادب کرنے والے، خالق کے عمل کا احترام کرتے ہیں، اور خالق کا عمل مخلوق کو پیدا فرمانا ہے۔ اللہ کریم نے بڑے وثوق سے اِنسان کو تخلیق فرمایا۔ اِنسان کو "احسنِ تقویم" کہا گیا۔ اللہ جب کسی کو اپنی بارگاہ میں مقبول فرماتا ہے تو اُسے مخلوق کی خدمت اور مخلوق سے محبّت کا راستہ عنایت فرماتا ہے۔

اللہ نے اپنے سب سے پیارے اِنسان ﷺ، اپنے محبوب اِنسان ﷺ کو سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ اللہ اور اُس کے فرشتے نبی ﷺ پر دُرود بھیجتے ہیں اور حضور ﷺ اللہ سے محبّت فرماتے ہیں اور آپ ﷺ مخلوق کے لیے باعثِ رحمت ہیں۔ اللہ کے تقرّب کی راہ مخلوق کی خدمت اور محبّت کی راہ ہے۔ مخلوق کو ناپسند کرنے والا کبھی خالق کا مُقرّب نہیں ہو سکتا۔ مخلوق کو ڈرانے والے، مخلوق پر حکومت کرنے کی تمنّا کرنے والے، خالق کے باغی ہیں۔ مخلوق کے لیے رحمتِ مجسّم، خالق کے لیے، خالق کی نگاہ میں، خیر البشر ﷺ ہیں۔

اللہ کے تقرّب کا ثبوت مخلوق سے محبّت میں پنہاں ہے۔ حضور ﷺ کی تمام زندگی مخلوق سے محبّت کی زندگی ہے۔ آپ ﷺ نے جانوروں سے، پرندوں سے، انسانوں سے، غرض

کہ اللہ کریم کی پیدا کی ہوئی ہر ذی جان و بے جان شے سے محبّت فرمائی۔ آپ ﷺ کا دِل یادِ الٰہی سے معمور ہے اور آپ ﷺ کا عمل خدمتِ خلق کا دستور ہے۔ فنکار سے محبّت دراصل اُس کے فن سے محبّت ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ سے محبّت کرنے والا، اللہ کی مخلوق سے محبّت نہ کرے۔ دراصل محبّت کرنے والا ہی خدمت کرنے والا ہے۔

خالق نے اپنی ذات کو مخفی رکھا ہے اور صفات کو آشکار فرمایا ہے۔ ذات سے محبّت ہو تو صفات کا احترام لازم ہے۔ مُقرّبینِ حق ہمیشہ اِنسانوں کی خدمت کرتے رہے، اُنہیں صداقت کی راہ دکھاتے رہے، اُن کی مشکلات کو آسان فرماتے رہے اور اُن کے ظاہر و باطن کی خدمت کرتے رہے۔ خدمت مخلوق کی اور تقرّب خالق کا — یہ راز ہر مُقرّب پر عیاں ہوا۔ عبادت بھی تقرّبِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اگر عبادت ہی تقرّب کا ذریعہ ہوتی تو اِنسان پر زندگی کے دیگر فرائض نہ عائد کیے جاتے۔

قرآن کریم میں اللہ نے اپنے تقرّب کی جتنی راہیں دکھائی ہیں، اُن میں سجدے کے علاوہ سب راہیں مخلوق سے محبّت کی راہیں ہیں۔

اَولاد کے لیے ماں باپ کا اَدب اللہ کے قُرب کا ذریعہ ہے، یعنی ماں باپ کی خدمت کرنے والا اللہ کا مُقرّب ہوتا ہے۔ ہمیشہ سچ بولنے والا، یعنی لوگوں سے صداقت کی بات کہنے والا مُقرّب ہے۔ اِنسانوں پر ظلم نہ کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ غصّہ نہ کرنے والا، لوگوں کو معاف کر دینے والا، لوگوں پر احسان کرنے والا، اللہ کو محبوب ہے۔

زمین پر اِترا کر نہ چلنے والا اِنسان اللہ کو پسند ہے۔ وہ اِنسان جس کا دِل محبّت سے سرشار ہے، اللہ کے قریب ہے۔ اللہ سے محبّت ہی اِنسانوں سے محبّت ہے۔ اللہ کے مُقرّب کسی کے لیے بددُعا نہیں کرتے، کسی پر ظلم نہیں کرتے، ظالم ہونے پر مظلوم ہونے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ کے مُقرّب دُنیا کے عبرت کدے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اِنسانوں کی دُنیا میں اِنسانوں سے حُسنِ سلوک ہی راہِ حق ہے۔

اللہ کے نام پر خیرات اِنسانوں کو دی جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اِنسانوں کی خدمت کے لیے خرچ کرنا ہے۔ یتیم کی خدمت کسی اِنسان کی خدمت ہے، غریب کی مدد کسی اِنسان کی مدد ہے۔ بیمار پُرسی کسی اِنسان کے لیے ہے۔ ماں باپ اِنسان ہیں۔ اللہ کی اطاعت، پیغمبر کی اطاعت سے مشروط ہے اور پیغمبر ﷺ اِنسانوں کی طرح اِنسان ہیں۔ اُن پر وحی کا نزول ہوتا ہے اور وحی کی تعلیمات اِنسان کو رحمتِ عالم ﷺ بنانے کا علم ہے — گویا کہ اِنسان اِنسانوں کے قریب ہو جائے تو اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ ایک اندھا آدمی اگر توجہ سے محروم ہو جائے تو آسمانوں سے فرشتہ وحی لے کر آتا ہے کہ اے حبیب ﷺ! اُس اندھے کی طرف توجہ نہ کر کے اللہ کو بہت خوش تو نہیں کیا!

اللہ نے ہمیں دنیا میں بھیجا ہے، اِنسانوں کی دنیا میں۔ اگر اپنے پاس ہی رکھنا ہوتا تو اللہ اپنے پاس ہی رہنے دیتا۔ اِس دُنیا میں آنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اِس دُنیا کی رونقوں میں رہ کر اللہ کو یاد رکھا جائے، اللہ کا تقرّب تلاش کیا جائے۔

اللہ کی تلاش اِنسان کو کسی اِنسان ہی کے پاس لے جاتی ہے۔ اللہ کا راستہ تنہائی میں دریافت ہوتا ہے اور یہ راستہ اِنسانوں میں رہ کر طے کیا جاتا ہے۔

اگر اِنسان کے لیے صرف یادِ حق ہی سب کچھ ہوتی تو مُقرّب ﷺ کی ذات غارِ حرا سے باہر نہ آتی۔ جو اِنسان اللہ کے جتنا قریب ہو گا، اُتنا ہی مخلوق کے قریب ہو گا۔ اللہ کے قریب رہنے والے پیغمبروں کو مخلوق کے قریب ہی دیکھا گیا۔ اللہ کا قُرب یقیناً مخلوق کا قُرب ہے لیکن مخلوق کا قرب ضروری نہیں کہ اللہ کا قُرب ہو۔ یہ راز جاننا ضروری ہے۔

اِنسان اگر مخلوق کی خدمت، مخلوق سے محبّت، اپنے کسی مقصد کے حصول کے لیے کرتا ہے تو یہ عمل اللہ کے تقرّب کا باعث نہیں۔ اگر مخلوق کی خدمت اللہ کی رضا کے لیے ہو تو یہ عمل باعثِ قربِ حق ہے۔ نہیں، تو نہیں!

آج ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔

ایک دُوسرے سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ وجہ یہ بیان ہوتی ہے کہ ہم یہ برداشت نہیں کرتے کہ لوگ ہمارے عقیدے کے علاوہ عقیدہ رکھیں، وغیرہ وغیرہ!

اگر ہم ٹھنڈے دِل سے غور کریں تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہم جسے برداشت نہیں کرتے، اُسی کو تو اللہ نے پیدا فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات میں اپنے نہ ماننے والوں کو خود پیدا فرما کر بڑے راز عیاں فرمائے ہیں۔ اللہ اپنے نہ ماننے والوں کو صرف پیدا ہی نہیں فرماتا، اُنہیں رِزق عطا فرماتا ہے۔ اُن کی دنیاوی ضرورتوں کا خیال رکھتا ہے۔ اُنہیں پالتا ہے۔ اُن کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ چاہے تو اُنہیں پیدا ہی نہ فرمائے۔ اُنہیں ہمیشہ کے لیے نیست ونابود کر دے۔ وہ خالق ہے۔ اُس نے ہر طرح کی مخلوق پیدا فرمائی ہے۔ اللہ نے اعمال کے نتیجے کے لیے ایک دِن مقرر فرما رکھا ہے۔ اللہ کے باغی ایک آنے والے دِن کو اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھیں گے، دیکھیں گے اور افسوس کریں گے۔ افسوس کریں گے اور کہیں گے: ''کاش! ہم مٹی ہی ہوتے''۔ وہ دِن اُس دِن سے پہلے کیسے آئے!

اللہ کے مُقرّب اِس بات سے آگاہ ہوتے ہیں کہ کافر کو دینِ حق کی دعوت اِس لیے دی جائے کہ اللہ کی رضا ہے، بس اِسی حد تک۔ تبلیغ کو اپنی ذاتی اَنا کا مسئلہ نہ بننے دیا جائے۔ اللہ کے نام کی دعوت بھی دو، اور اللہ کی منشا کے مطابق اُسے زندہ رہنے کا حق بھی دو۔

تقرّبِ حق کی منزل بڑی کٹھن ہے۔ اللہ کی رضا پر اپنی رضا کو نثار کر دینا قربِ حق ہے۔ اللہ کی مخلوق کو اللہ کی مخلوق سمجھنا قربِ حق ہے — یہ جان لینا کہ یہ سب مخلوق، یہ سب تخلیق، عین حق ہے۔ یہ سب باطل نہیں۔ اللہ کی کائنات میں کچھ بھی تو باطل نہیں۔ خیر ہو یا شر، اُس کی تخلیق کے رنگ ہیں۔ اللہ کی دُنیا پر، یعنی خیر کی دُنیا پر ''شر'' کسی اور جہان سے حملہ آور نہیں ہوتا، یہ اِسی دُنیا کا حِصّہ ہے، اُسی خالق کی تخلیق۔ ابلیس، اللہ کے مقابلے میں ایک اور مساوی اور مخالف طاقت نہیں۔ ابلیس، اللہ کی مخلوق میں ایک باغی اور منکر طاقت ہے، اللہ ہی کی مخلوق، اللہ کے قبضۂ قدرت میں، اپنی بغاوت اور سرکشی کی میعاد میں مہلت مانگنے والا، اپنی

آخری سزا کا منتظر، اللہ کی رحمت سے مایوس، اپنی نامرادی اور عبرت سے آشنا— اللہ کا باغی تو ہے، اُس کا مقابل نہیں۔ ابلیس مخلوق ہے، اللہ خالق ہے۔ برابری کیسے؟

اللہ کے مُقرّب جانتے ہیں کہ اللہ کا ہر عمل درست، اُس کا ہر فعل مبارک۔ مُقرّب گلہ اور شکوہ نہیں کرتا۔ تقرّبِ حق کی منزل جھگڑے اور فساد کی منزل نہیں۔ یہ تسلیم ورضا کی منزل ہے، محبّت و ایثار کی منزل ہے، یقین وایمان کی منزل ہے، عقل و آگہی کی منزل ہے، سوز و عشق کی منزل ہے، یقینِ بے گماں اور سرورِ جاوداں کی منزل ہے، کائنات کو جلوۂ حق سمجھنے کی منزل ہے، اِنسانوں سے پیار کی منزل ہے، خالق سے مخلوق اور مخلوق سے خالق شناسی کی منزل ہے، وحدت سے کثرت اور کثرت سے وحدت کے جلوے تلاش کرنے کی منزل ہے، یہ بے تاب دِل اور متحیّر دماغ کی منزل ہے۔ تقرّبِ الٰہی کی منزل عرفانِ مخلوق سے عرفانِ خالق تک کا سفر ہے۔ مخلوق کی خدمت خالق کی خدمت ہے، مخلوق سے محبّت خالق سے محبّت ہے، اور مخلوق کو ناپسند کرنا خالق کی محبّت سے محروم ہونے کی دلیل ہے۔ جس نے خالق کا تقرّب حاصل کرلیا، اُس پر مخلوق کا راز منکشف ہو گیا۔ مخلوق کا راز تقرّبِ حق کے اَسرار میں سب سے بڑا راز ہے۔ جس پر یہ راز آشکار ہو گیا، اُس کے دل سے محبّت الٰہی کے چشمے پھوٹ نکلے۔ اُس کا مخلوق کے لیے سراپا رحمت بن جانا ہی اُس کے تقرّبِ حق کی سب سے بڑی اور سب سے قوی دلیل ہے۔ سلام ہو اُس مُقرّبِ حق کی خدمت میں، جس کا لقب ہی رحمۃ للعالمین ﷺ ہے!

۩۩۩

محبوب

عجب بات ہے کہ محبوب بیٹا جدا ہوا تو باپ کی بینائی چھن گئی اور مُدّت بعد بیٹے کی قمیض کی خوشبو سے بینائی لوٹ آئی۔ کہیں محبوب، بینائی ہی نہ ہو! اپنی چاہت کا چہرہ نہ رہے تو بینائی کیا بینائی ہے۔ شاید دیکھنے کی تمنّا ہی بینائی ہے۔ شاید محبوب کا چہرہ ہی بینائی کا سبب ہے اور یہی چہرہ بینائی کا انجام۔

محبوب محبّ کی زندگی میں عجب رنگ دِکھاتا ہے۔ محبّت اِنسان کو ماسِوائے محبوب سے اندھا کر دیتی ہے۔ وہ کسی اور شے کو دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اُس کے دِل و نگاہ میں صرف ایک ہی جلوہ رہتا ہے، محبوب کا جلوہ!

محبوب زندگی کے صحرا میں نخلستانوں کی نوید ہے۔ محبوب محبّ کو زِندگی کے میلے میں اکیلا کر دیتا ہے۔ محبوب ہی باعثِ سفر ہے، وہی ہم سفر ہے، وہی رہنمائے سفر ہے اور پھر وہی محبوب ہی تو حاصلِ سفر ہے۔

محبوب کبھی جلوہ بن کے رُوبرو ہوتا ہے اور کبھی یاد بن کر چارسُو ہوتا ہے۔ محبوب جدا ہو کر بھی جدا نہیں ہوتا۔ وہ مر کے بھی نہیں مرتا۔ وہ محبّ کی آنکھ میں رہتا ہے۔ آنکھ سے اوجھل ہو تو دِل میں آبستا ہے۔ محبوب ختم نہیں ہوتا، غائب نہیں ہوتا۔ وہ کبھی عدم نہیں ہوتا۔

دنیا کی رونقیں محبوب کے دَم سے ہیں۔ اِنسان اپنی زندگی کو محبوب کی خوشنودی کے لیے وقف کرتا ہے۔ اِنسان تو اِنسان، کائنات کی سب مخلوق اپنے محبوب کے لیے سرگرداں ہے۔ مور کا رقص، رمِ آہو، نغمۂ عنادل، چکور کی فریاد، لہروں کا تلاطم محبوب کی کرشمہ کاریاں

ہیں۔ محبوب محبّ کو شعورِ زیست عطا کر کے شعورِ ذات عطا کر تا ہے۔ سجدے سے انکار کرنے والا، حُسنِ آدم سے بے خبر اِبلیس محبّت سے محروم تھا۔ وہ رحمت سے مایوس ہوا۔ مردود قرار دے دیا گیا۔ اِبلیس کا معبود تو تھا، محبوب کوئی نہ تھا۔ لعین ہونے کے لیے اِتنا ہی کافی ہے۔ اِنسان کی محبّت کے بغیر خدا کا سجدہ اَنا کا سجدہ ہے۔ خدا اِنسان سے محبّت کرتا ہے، اور اِبلیس اور اُس کے چیلے اِنسان سے محبّت نہیں کرتے۔ کیسے کر سکتے ہیں!

اِنسان سے محبّت وہی کر سکتا ہے جس پر خدا مہربان ہو۔ خدا جب کسی پر بہت مہربان ہو تو اُسے اپنے بہت پیارے محبوب ﷺ کی محبّت عطا کر دیتا ہے۔ اللہ کے اِحسانات میں سب سے بڑا اِحسان محبّت ہے۔ محبّت کم ظرف اور کم نظر کا کام نہیں۔ یہ عالی ظرف اور بلند نگاہ اِنسانوں کا کھیل ہے۔ یہ بلند نصیب اِنسانوں کی بات ہے۔ اِس زندگی میں جسے محبوب مل گیا، اُسے سب کچھ ہی تو مل گیا۔

محبوب کے ملنے کی دیر ہے کہ زندگی نثر سے نکل کر نظم میں داخل ہو جاتی ہے۔ محبوب خود شعرِ نازک ہوتا ہے۔ اُس کا قرب محبّ کو شعر آشنا کر دیتا ہے۔ جسے محبوب نہ ملا ہو، جسے محبّت نے قبول نہ کیا ہو، اُسے غزل بے معنی نظر آتی ہے۔ اُسے نظم سے بیر سا ہو جاتا ہے۔ محبوب میسّر نہ ہو تو رعنائیِ خیال کا ملنا محال ہے۔

محبوب اُس ذات کو کہتے ہیں جس کے تقرّب کی تمنّا کبھی ختم نہ ہو۔ اپنی ذات سے فنا ہو کر جس کی ذات میں بقا ہونا منظور ہو، اُسے محبوب کہا جاتا ہے۔ محبوب محبّ کے حُسنِ انتخاب اور حُسنِ خیال ہی کا نام ہے۔

ہر زندہ اِنسان کے لیے کوئی نہ کوئی محبوب ضرور ہو گا۔ جن کا کوئی محبوب نہیں، وہ اپنے آپ سے محبّت کرتے ہیں، اپنی اَداؤں پر مرتے ہیں۔ اپنے خون کی سرخی پر فدا ہونے کی خواہش، اُن کے خون کے سفید ہونے کی دلیل ہے۔ ایسے لوگ آئینہ خانوں میں اکثر دیکھے جاتے ہیں، نہ وہ کسی کو پسند کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور اُن کو پسند کرتا ہے۔ ظاہر ہے، اُن کی

زندگی ایک جزیرے کی طرح ہے۔ وہ خود ہی آواز ہیں اور خود ہی گوش بر آواز۔ ایسے لوگ سخت دِل اور تُند خُو ہوتے ہیں۔ اُن کے نصیب میں تنہائیاں ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کبھی خودی سے آشنا بھی ہو جاتے ہیں۔ اُن کو اپنے ہی سِرِّ نہاں تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اُن کا محبوب—اُن کی ذات، اُن کے لیے کرشمہ کاریاں کر جاتی ہے۔

آج کے دَور کا اِنسان محبوب سے آزاد سا ہو گیا ہے۔ وہ اِنسانوں سے مایوس ہو چکا ہے۔ وہ اپنے آپ سے مایوس ہو چکا ہے۔ اُسے کسی پر کسی حالت میں اعتماد نہیں۔ وہ اپنے ماضی پر تو نادم ہے ہی سہی، اپنے مستقبل پر بھی نادم ہے۔

آج کے اِنسان کا محبوب، سرمایہ ہے۔ وہ اپنے مال کو اپنا محبوب مانتا ہے۔ اُسے چاہتا ہے۔ اُس کی پوجا کرتا ہے۔ اُس کے وِصال سے خوش ہوتا ہے اور اُس کے فراق سے ڈرتا ہے۔ آج کے اِنسان کو موت سے زیادہ غریبی کا ڈر ہے۔ مال کی محبّت نے اندھا کر دیا ہے، اِنسان کو غافل کر دیا ہے۔ اُس کی آنکھ تب کھلتی ہے، جب بند ہونے لگے۔ بڑی محرومیاں ہیں، آج کے محبّ کے لیے، آج کے محبوب کے حوالے سے!

مال کا عجب حال ہے۔ پڑا رہے تو بے کار ہے۔ اِس کی افادیّت اِس کے خرچ میں ہے، اِس کے اِستعمال میں ہے، اِس کی جدائی میں ہے۔ یہ محبوب ہمیشہ سے ہر ایک کے ساتھ بے وفا ہے، بے وفا رہا ہے اور بے وفا رہے گا۔ بے جان مال کی محبّت جان دار اِنسان کو اِخلاقی قدروں سے محروم کر دیتی ہے۔ مال کی محبّت حریص بناتی ہے اور حریص کی جیب بھر جائے تو بھی دِل خالی رہتا ہے۔

کچھ لوگ خدا سے محبّت کرتے ہیں، صرف خدا سے، اور بس — خدا کے بندوں سے نہیں۔ خدا کے بندوں سے محبّت نہ کرنے والوں کو خدا کیسے پسند کر سکتا ہے! خدا کے حبیب ﷺ تو وہ ہیں جو مخلوق کے محبّ اور خالق کے محبوب ہیں۔ اللہ کی محبّت کا راز اِنسان کی محبّت میں ہے۔ اللہ معبود ہے، اِنسان محبوب۔ اللہ کی راہ اِنسانوں کی راہ ہے—اِنعام یافتہ اِنسانوں کی!

آج کے محبوب ،مال نے آج کے اِنسان کو بڑی محرومیاں عطا کی ہیں۔ آدمی، آدمی سے دُور ہو رہا ہے۔ جغرافیائی فاصلے ختم ہو رہے ہیں لیکن دِلوں اور نگاہوں کے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ خاندان تو ختم ہو ہی چکا ہے۔ میاں بیوی، اولاد اور والدین کے درمیان پیسے کی دِیوار حائل ہو چکی ہے۔ بیوی خاوند سے جدائی برداشت کر سکتی ہے، پیسے سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ مال کے مقدّر میں پردیس لکھا جا چکا ہے۔ خاوند پردیس میں ہے، بیوی خطوط اور مال پر گزارہ کر رہی ہے۔ گھر سجائے جا رہے ہیں اور جس کی خاطر مقصود تھی، وہ نظر نہیں آتا، کمائیاں کرنے گیا ہوا ہے۔

کچھ لوگوں کا محبوب، نظریہ ہے۔ نظریات کی محبّت نے مُلکوں میں فساد مچا رکھا ہے۔ دائیں اور بائیں کی تقسیم قوم کو تقسیم کر چکی ہے۔ بھائی بھائی کے رُوبرو ہے، بلکہ دُوبدو ہے۔ گلستانِ وطن میں بڑے گُل کِھلنے والے ہیں۔ نظریہ پرست اِنسان، مردم بیزار ہے۔ نظریات کی جنگ کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ صورتِ حال خوفناک ہے۔ اِنسان تقسیم ہو چکا ہے۔ ایران، عراق، نظریات ہیں۔ ہر دو فریق، مصروفِ جہاد — سچّے خدا کے نام پر دونوں گروہ جنگ کر رہے ہیں۔ کون سچّا ہے کون جھوٹا — دونوں سچّے تو نہیں ہو سکتے۔ محبوب پرستی جنگ پرستی تو نہیں ہو سکتی۔ اپنے ہاں حکومت اور حزبِ مخالف، دو نظریے برسرِپیکار ہیں۔ اِنسان کی محبّت سے محروم لوگ نظریات کی گرفت میں ہیں۔

اِنسان سے محبّت نہ ہو تو وطن کی محبّت بھی واہمہ ہے۔ جس دیس میں ہمارا کوئی محبوب نہ ہو، اُس دیس سے محبّت ہو ہی نہیں سکتی۔ آج کے اِنسان کی وطن پرستی اِس لیے مشکوک ہے کہ وہ اِنسانوں کی محبّت سے عاری ہے۔ زمین، مکان اور پیسے سے محبّت کرنے والا اِنسان محبّت کی اصل رُوح سے محروم ہے۔ وطن اِس لیے پیارا ہوتا ہے کہ ہمارے پیارے اِس میں رہتے ہیں، ورنہ وطن کیا اور وطن کی محبّت کیا! اگر محبوب وطن سے باہر ہو تو محبّت وطن سے باہر ہو جائے گی۔

محبوبوں میں سب سے زیادہ خطرناک محبوب شہرت ہے۔ شہرت سے محبّت کرنے والا دراصل اپنی اَنا کا پرستار ہے۔ اِنسانوں میں خدمت کے بغیر سربُلندی کی تمنّا ظلم ہے۔ جھوٹے معاشرے میں شہرت حاصل کرنے والا سچّے معاشرے میں بدنام گنا جائے گا۔

فراق و وصال

جب تک اِنسان چاندنی میں تھا، اُسے چاند تک پہنچنے کی تمنّا تھی— چاندنی میں لُطف تھا، لیکن چاند پاس نہیں تھا—چاندنی پاس تھی اور چاند کے لیے طبیعت اُداس تھی—اِنسان چاند پر جا پہنچا—وہاں چاند تھا، لیکن افسوس کہ وہاں چاندنی نہ تھی—! چاندنی ہو تو چاند نہیں ملتا، چاند ملے تو چاندنی نہیں ملتی— عجب بات ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دَم سے ہیں —ایک دوسرے کی پہچان ہیں—لیکن ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ—!

چاند محبوب ہو تو چاندنی اُس کی یاد ہے — محبوب پاس ہو تو یاد پاس نہیں ہوتی — یاد پاس ہو تو محبوب پاس نہیں ہوتا—ایک کا تقرّب دوسرے سے بُعد ہے—ایک سے وصال دوسرے سے فراق کا ذریعہ ہے۔ محبوب سے وِصال ہو تو یاد سے فراق ہو جاتا ہے۔ یاد سے وِصال ہو تو محبوب سے فراق ہو جاتا ہے، گویا کہ ہر فراق میں وِصال پوشیدہ ہے اور ہر وِصال میں فراق شامل ہے—اگر عشق کو تمنّائے حبیبؐ کا نام دیں تو اِس میں فراق کا ہونا لازمی ہے۔ تمنّا کی ہستی مشاہدے تک ہے۔ دِیدار سے تمنّا کا آغاز ہوتا ہے اور تمنّا دِیدار کی یاد میں پلتی ہے—جو ایک بار دیکھا، اُسے دوبارہ دیکھنے کی آرزو عشق ہے— عشق ہمیشہ فراق سے گزرے گا— عشق ہجر کے آتش کدوں میں جوان رہتا ہے—اور وِصال کے برف خانوں میں منجمد ہو جاتا ہے۔

بات کہنے کی نہیں—بس صرف غور کرنے کی بات ہے۔ فرشتے ہمہ وقت تقرّب میں ہیں—وِصال میں ہیں—وہ عشق سے محروم ہیں—وہ صرف فرشتے ہیں۔ اِنسان—فراق میں ہے— عشق میں ہے—اِنسان کے پاس یاد ہے—اور یہی فرق ہے دُنیا اور آخرت کا—

یہاں اللہ کی یاد ہے—اور وہاں دِیدار ہو گا۔اِنسان کو اشرف بنایا گیا—اُس کا شرف یہی ہے کہ اُس کے پاس فراق ہے—اُس کے پاس عشق ہے—اُس کے پاس یاد ہے—تمنّائے وِصال ہے — اور فرشتے اطاعت میں ہیں — عشق میں نہیں۔ عشق سوز ہے، عشق ساز ہے، عشق خاموشی ہے، عشق آواز ہے—عشق میں حُسن کا سب سے بڑا راز ہے،یعنی فراق ہی تو وِصال کا حاصل ہے۔

دُنیا کے عظیم شاہکار فراق کے کرشمے ہیں—رومیو جولیٹ، ہیر رانجھا، سَسّی پُنّوں، سوہنی مہینوال —اور اِس طرح کے اور کئی دل نواز، دل سوز اور دِل گداز واقعات دریائے فراق کی جواں موجیں ہیں—!

محبوب کا سب سے قیمتی تحفہ اپنے محبّ کے لیے فراق کا تحفہ ہے—فراق کے زمانے شخصیت ساز زمانے ہوتے ہیں۔ اِنہی دِنوں میں اِنسان کے اندر کا اِنسان بیدار ہوتا ہے — خوابیدہ اور خفتہ صلاحیتیں دریافت ہوتی ہیں۔ اِنسان کا اپنا باطن اُس پر آشکار ہوتا ہے۔ محبوب کی یاد اُسے جگاتی ہے اور جاگنے والا اِنسان فراق کی راتوں سے اور بھی بہت کچھ حاصل کرتا ہے —ہجر کی رات، غم کی رات، عرفانِ ذات کی رات ہوتی ہے —اِنسان کے آنسو اُس کے لیے ایک عظیم مقدّر لکھتے ہیں۔ کسی کی یاد میں جاگنے والا کبھی بد قسمت نہیں ہو سکتا۔ کسی کے دَرد میں رونے والا دُنیا کے ہزارہا غم سے آزاد ہو جاتا ہے۔ محبّت کا سجدہ اِنسان کو ہزار سجدوں سے نجات دیتا ہے۔ فراق والے نالۂ نیم شب سے آشنا کرائے جاتے ہیں— وہ زمانے کا مقدّر بھی سنوار سکتے ہیں—ایسے لوگوں میں مقدّر ساز اِنسان بھی پیدا ہوئے۔

فراق آگہی کا چراغ ہے— یہ جنوں کا روشن ستارا ہے— ذرّے میں آفتاب کے جلووں کی دریافت ہے—جُزو میں کُل کا اِدراک ہے— قطرے میں قُلزم کی پہنائی کا عرفان ہے۔

وصال صرف ذات تک ہے—جبکہ فراق ساری کائنات تک—عالمِ شش جہات

تک — افہامِ ممکنات و ناممکنات تک — رموزِ حیات و ممات تک —!

فراق ہی کو ہُدہُدِ فرخندہ فال کہا گیا ہے — اُسے ہی طوطیٔ شکر مقال کہتے ہیں — فراق ہی ظاہری اور باطنی بیماریوں کا افلاطون ہے اور جالینوس ہے — اُس کے سامنے فاصلے، فاصلے نہیں — زمانے، زمانے نہیں — زمین و آسمان کی وسعتیں صاحبانِ عشق ہی طے کرتے ہیں۔

محبوب کا فراق مجاز کو حقیقت بنا دیتا ہے — ماسواء کو ماوراء سے کیا نسبت ہے — کوئی صاحبِ عشق بتائے تو بتائے۔ عشق صفات کو ذات کا حوالہ دیتا ہے — عشق جانتا ہے کہ جلوۂ ذات کہاں ہے اور ذات کہاں — قطرہ دریا سے واصل ہو کر اپنی ہستی کھو دیتا ہے اور دریا کا درد قطرے کو سوزِ جاوداں دے کر اُسے کبھی شبنم، کبھی موتی، کبھی آنسو بناتا رہتا ہے۔

اِس کائنات کی تمام روشنی صرف روشن ذات کی یاد ہے — اُس کا عشق ہے۔ اِنسان کی ہستی کے تمام بلند تقاضے فراق کی دریافت ہیں۔ موسیقی، شعر، فنِ تعمیر و تصویر، تخلیقِ ادب فراق کی لہروں میں پلتے ہیں۔ تمام تخلیقی اَدب اور اَدبی تخلیقات عشق کی دین ہیں۔ حُسن خود اپنے طالب میں دَرد کے چراغ جلاتا ہے اور پھر اِن ہی چراغوں میں خونِ دِل جلتا ہے اور کوئی فراق زدہ اِنسان اِن ہی چراغوں سے اپنے زمانے میں چراغاں کر جاتا ہے۔

سوچنے والی بات ہے کہ چاند سے کیا چیز نکلی کہ دُنیا میں چاندنی بن کر بکھر گئی۔ وہ کیا راز ہے کہ دیارِ یار سے نکلنے والا بے قرار عاشق زمانے بھر کا قرار بن گیا —!

وِصال جمود ہے اور فراق تحرّک ہے — وِصال موت ہے، فراق زندگی ہے — زندگی کی نیرنگی اور رنگینی ہے —!

فراق محرومی نہیں — یہ تو محبوب سے حاصل ہونے والا انتہائی قیمتی خزانہ ہے — یہ امانت ہے، جو صرف اُسی کو دی جاتی ہے جو اہل ہو — پہاڑ، زمین اور آسمان جس امانت سے لرز جائیں — انکار کر جائیں — وہ امانت اِنسان کے دِل کے لیے اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ہے — عشق — یہ دولت علم اور دانائی سے نہیں ملتی — مگس کو پروانے کا دِل نہیں مل سکتا، یہ خدا کی دین

ہے— کہ وہی حُسن ہے اور عشق کی سب کار فرمائی اُسی کے فراق کی عطا ہے۔

قصّہ کوتاہ— سب محبوب کے اپنے جلوے ہیں— محبوب نظروں میں رہے تو وِصال کے موسم ہیں، بہاروں کے دِن ہیں— اگر محبوب دِل میں آ بسے تو فراق کے موسم ہیں— انوکھی بہاروں کے دِن ہیں— فراق کی بہار میں موتی بنتے ہیں— پھول کھلتے ہیں، یعنی کئی قسم کے گُل کھلتے ہیں۔ آسمانِ فکر سے تارے گرتے ہیں— آنکھوں سے اَنگارے ٹپکتے ہیں۔ یہ دُنیا فراق کی وادی ہے— یہ دیس تو بس پردیس ہے— تمنّاؤں کا جہان ہے— یادوں کے کعبے میں عقیدت کے سجدے ہیں اور پھر اس کے بعد— جلوۂ ذات کے بعد صرف ذات ہی ذات ہے— نہ چُوں نہ چراں— نہ آنکھ جھپکنے کا موقع، نہ دِل دھڑکنے کی اجازت— محویتِ جمال، بارگاہِ حُسن میں سَنّاٹا— نہ دشوارئ راہ کا گلِہ— نہ دیرینہ جدائیوں کا شِکوہ— نہ ہونے کی خبر— نہ، نہ ہونے کا علم! وِصال صرف محویت ہے— فراق مستی ہے— سرمستی ہے۔ یاد کے عظیم صحرا میں صرف اَشکوں کا دریا ہے جس سے متلاشی سرمدی مَے کے جام پیتے ہیں اور روز مرتے ہیں، روز جیتے ہیں— بات تعلّق کی ہے— قریب اور دُور کی نہیں!

۩۩۩

دُکھیا سب سنسار

بیوی نے خاوند کو الوداع کہا۔ جہاز اُڑا۔ خیال نے رِفعتوں کو چھُوا۔ حوصلے بلند ہوئے۔ یہ سفر آسودگی کی نوید تھا۔ خاوند کو نوکری مل گئی تھی، وطن سے دُور، دیارِ غیر میں۔ تنخواہ ڈالروں میں تھی۔ دِن گزرتے ہی گئے۔ بیوی انتظار کرتی رہی۔ خاوند کا نہیں، اُس کے بھیجے ہوئے پیسوں کا۔ پیسے ملے۔ بہت سے پیسے ملے۔ مکان سجا۔ فانوس لگے۔ روشنی ہوئی۔ مہمان آئے۔ کھانے پکے۔ رونقیں ہوئیں۔ بس صرف گھر کا مالک ہی گھر میں نہ تھا۔ وہ بیچارہ پردیسی، دیس میں ہونے والی رونقوں کو کیا جانے! کچھ دنوں کے بعد دونوں ہی دُکھی تھے۔ تنہائی کا زہر اُن کے وجود میں اَثر کر رہا تھا۔ چراغ جلتے ہی رہے اور دِل بجھتے ہی رہے۔ اِس دُکھ کا کیا علاج! وطن میں رہو تو مال نہیں، مال ملے تو وطن نہیں۔ عجب صورتِ حال ہے۔ دُکھوں سے بچنے کے لیے کوشش کرنے والے ایک نئے دُکھ کے حوالے ہو جاتے ہیں۔

کیا زندگی میں دُکھ کا ہونا لازمی ہے؟ کیا زندگی دُکھ ہی کا نام ہے؟ اِس کائنات میں، اِنسانوں کی کائنات میں کوئی بھی تو نہیں جس کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں۔ آج کا اِنسان بہت دُکھی ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ رہا ہے۔ اُس کا ظاہر بے خراش بھی ہو تو بھی اُس کا باطن قاش قاش ہوتا ہے۔

آرزوؤں کی کثرت نے انسان کو دُکھی کر رکھا ہے۔ کثرت ہمیشہ دُکھی کرتی ہے۔ ایک خواہش پوری ہو تو دوسری پوری نہیں ہوتی۔ خوشی کا ایک لمحہ غم اور اندیشوں کے لمحات کو جنم دیتا ہے۔ ایک حاصل میں کتنی ہی محرومیاں چھپی ہوتی ہیں۔ اِنسان جو کچھ بھی ہوتا ہے، اُس

کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور انسان فطرتاً اپنے علاوہ کچھ اور ہونا چاہتا ہے۔ دُنیا اُسے ایک نام، ایک صفت سے پکارنے لگ جائے تو وہ خواہش کرتا ہے کہ لوگ اُسے دوسرے نام، دوسری صفت کے حوالے سے پکاریں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ پس وہ دُکھی ہو جاتا ہے۔

ہر انسان چاہتا ہے کہ اُسے چاہا جائے، اُسے پسند کیا جائے، لیکن کیوں؟ اِسی "کیوں" سے ہی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ لوگ اپنے علاوہ کسی کو پسند نہیں کر سکتے اور خود پسندی کی عادت بھی خود گریزی کی علامت ہے۔ اِنسان خود کو بھی ہمیشہ کے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ پس اِنسان دُکھی رہتا ہے۔

انسان کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد کو خوشی کا ذریعہ سمجھتا ہے لیکن کثرتِ مال محض وبال ہے اور کثرتِ اولاد اکثر اِنسان کے لیے دُکھ کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ اولاد کی آرزو اور اولاد کی پرورش کی تمنّا اور پھر اولاد کی اپنی آرزوئیں اِنسان کے لیے ایک عجب مصیبت ہیں۔ اولاد مؤدّب نہ ہو تو ایک عذاب ہے۔ آج کل اولاد کا مؤدّب ہونا ایک مشکل مسئلہ ہے۔ آج کے بچّے آج کے اِنسان کے دُکھ کی علامت بھی ہو سکتے ہیں۔

ایک آدمی کو دیکھا گیا کہ وہ کسی خانقاہ پر جا کر زور زور سے دُعا مانگ رہا تھا: "اے اللہ! تُو نے میری وہ دُعا جو سولہ سال پہلے منظور کی تھی، اُسے اب نا منظور فرما دے۔ اے صاحبِ آستانہ بزرگ! تُو بھی آمین کہہ"۔ لوگوں نے کہا: "تُو کیا کہہ رہا ہے؟" اُس نے کہا: "مَیں منظور شدہ دُعا کی نامنظوری چاہتا ہوں"۔ لوگوں نے تفصیل پوچھی تو اُس نے کہا: "آج سے سولہ سال پہلے میں اِسی آستانے پر حاضر ہُوا تھا، مَیں نے اللہ کے آگے دُعا کی کہ اِلٰہی! مجھے بیٹا عطا فرما۔ اللہ کی مہربانی اور اِس بزرگ کے وسیلے سے مجھے بیٹا ملا۔ آج وہ جوان ہے اور مَیں کیا بتاؤں کہ اُس بیٹے نے مجھے کتنا تنگ کر رکھا ہے۔ مختصر یہ کہ مَیں دُعا کرتا ہوں کہ میری قدیم منظور شدہ دُعا کو نامنظور فرما لے، میرے اللہ!"

اِنسان کبھی راضی نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ خوشی کی تلاش کرتا ہے اور اُسے کسی نہ کسی

طرح غم سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور مجبوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے مقدّر میں موت لکھی جاچکی ہے اور اِسی حقیقت کا انکشاف ہی اِنسان کے کرب کی اِبتدا ہے۔ اُس کا حاصل، لاحاصل ہو کے رہ جاتا ہے۔ اُس کی قوّت کمزوری بن جاتی ہے۔ اُس کا توانا وجود لاغر و ناتواں ہو جاتا ہے۔ اُس کی بینائی کے چراغ مدّھم ہو جاتے ہیں۔ اُس کی فِکر مسدود ہو جاتی ہے۔ اُسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اُس کے آگے دِیوار ہے، اُس کے پیچھے دِیوار ہے۔ وہ جکڑ کے رکھ دیا گیا ہے۔ وہ بھاگنا چاہتا ہے لیکن — ”رستہ اُسے رستہ نہیں دیتا“۔ وہ اپنے گھر میں کچھ عرصہ کے بعد خود کو مہمان سا محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنوں کے ہمراہ چلتا ہے اور چلتے چلتے اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیگانوں کے ساتھ چل رہا ہے۔ ساتھی بچھڑ جاتے ہیں اور اجنبی ہمراہ ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ بِھیڑ میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اُسے کرب اور دُکھ سے بچنا مشکل نظر آتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اپنے وجود میں رہنا اُسے ناممکن نظر آتا ہے اور وجود سے نکلنا بھی اتنا ہی ناممکن ہوتا ہے۔ نتیجہ دُکھ کے سِوا کیا ہے! وہ بے نام دُکھ پر روتا ہے اور رونے سے دُکھ ختم نہیں ہوتا۔

ایک آدمی اپنے کسی عزیز کی موت پر رو رہا تھا۔ لوگوں نے کہا: ”صبر کرو! اب رونے سے کیا ہو سکتا ہے“۔ اُس نے روتے روتے جواب دیا: ”بھائیو! رونا تو اِسی بات کا ہے کہ اب رونے کا بھی کچھ فائدہ نہیں۔ مَیں اپنے رائیگاں آنسوؤں پر ہی تو رو رہا ہوں۔ کرب ہی کرب ہے۔ دُکھ ہی دُکھ ہے اور مَیں —“

ہم اِس دُنیا سے کچھ لے کر بھاگ جانا چاہتے ہیں لیکن اِس دُنیا سے کچھ لے کر جا نہیں سکتے۔ بس یہاں سے اُٹھا کر وہاں رکھ سکتے ہیں۔ ہم سب قُلی ہیں۔ سامان اٹھائے پھرتے ہیں — خیال کا سامان، احساس کا سامان۔ مال، دولت، وجود — اَشیاء اُٹھائے اُٹھائے پھِرتے ہیں۔ کب تک؟ قُلی کا سامان کسی اور کا سامان ہوتا ہے۔ قُلی کے نصیب میں صرف وزن ہے — وزن اور صرف وزن — اور یہ وزن کرب ہے۔ اِس دُنیا میں کچھ بھی کسی کی ملکیت نہیں۔ ہمارے دفتر

ہمارے دفتر ہی نہیں ہیں، ہمارے ماتحتوں کے بھی ہیں۔ ہماری بادشاہت ہماری بادشاہت نہیں۔ یہ ملک ہماری رعایا کا بھی ہے۔ کوئی کسی کا مالک نہیں۔

یہاں جو کچھ ہے، یہیں رہے گا اور اِسے اپنا کہنے والا یہاں نہ ہو گا۔ بڑے کربناک مرحلے ہیں، اِس حیاتِ چند روزہ میں! ہم صرف اپنی ملکیت کی ملکیت ہیں۔ ہمارے بچّے ہمارے مالک ہیں۔ ہمارا مرتبہ ہمارا بوجھ ہے۔ ہماری رعایا ہماری عاقبت ہے، بلکہ عبرت ہے۔ ہمارے ماتحت ہماری آزمائش ہیں۔ ہمارے سامنے ہمارے خلاف گواہیاں چل رہی ہیں۔ ہم بڑے روگ میں ہیں۔ ہمارا ہونا، نہ ہونے تک ہے۔ ہماری ہستی، نیستی ہے۔ ہمارا وجود، عدم ہے۔ ہمارا دِل، دِلبروں کے توڑنے کے لیے بنا ہے۔ ہماری محبّت، ہماری قید ہے۔ ہماری نفرت، ہمارا عذاب ہے۔ ہمارے اپنے، ہمارے سپنے ہیں۔ ہماری آرزو، ہماری فریاد ہے۔ ہمارا غرور، ہمارا اپنا مذاق ہے۔ ہم حِصار میں ہیں — آرزوؤں کا حِصار، تمنّاؤں کی زنجیر۔ ہمارا علم، ہمارا حجاب ہے۔ ہمارا گھر، خوبصورت، لیکن زندان۔ ہم اِسی میں رہنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے بس میں بے بسی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ہم آزاد پیدا ہوئے، لیکن پیدا ہونے کی مجبوری کے ساتھ۔ ہماری جوانی، آزاد جوانی، بڑھاپے کی مجبوری ہے۔ ہم ریت کی دِیوار ہیں۔ گرتے رہنا ہمارا مقدّر ہے۔ ہمارے مقدّر میں کرب ہے، دُکھ ہے۔ اِس کربِ مسلسل سے نجات صرف اور صرف اپنی فنا کو تسلیم کرنا ہے۔ میری زِندگی جس نے عطا کی، وہی اِسے واپس لے لیتا ہے۔ اِس میں میرا کیا دخل ہے۔ کیا مَیں اپنے آپ میں اپنا دخل دینا چھوڑ سکتا ہوں؟ کرب سے نجات کی راہ یہی ہے۔ حکم دینے والے کا حکم زِندگی ہے تو ہم زِندہ ہیں۔ حکم دینے والا موت کا حکم دے تو ہم حاضر ہیں۔ افسوس کی بات نہیں، اطاعت کی بات ہے۔ اطاعت اور صرف اطاعت، دُکھ سے نجات ہے۔ یہاں نہ کچھ کھونا ہے، نہ پانا ہے — یہاں تو صرف آنا ہے اور جانا ہے۔ دُکھ کس بات کا!

خوف اور شوق

ڈر اِنسان کے اِحساس کا ایک قوی حِصّہ ہے۔ ہر حسّاس آدمی خوفزدہ رہتا ہے۔ خوف کی وجہ معلوم ہو یا نامعلوم، خوف قائم رہتا ہے۔ خوف انسان کی سرِشت میں شامل ہے۔ اِس سے مَفر مشکل ہے۔

جب تک زندہ رہنے کی خواہش زندہ ہے، زندگی کے ختم ہو جانے کا ڈر ختم نہیں ہو سکتا۔ ڈر ایک سائے کی طرح اِنسان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہتا ہے۔

نئی خواہشیں نئے اندیشے پیدا کرتی ہیں اور نئے اندیشے نئی خواہشیں تخلیق کرتے ہیں۔ خواہش کے نہ پُورا ہونے کا ڈر ہر خواہش کے باطن میں موجود رہتا ہے، اور ڈر کے باوجود اِنسان خواہش کو نہیں چھوڑتا۔

بے یقینی کی فضا اور غیر یقینی حالات نے اِنسان کو اندیشے عطا کیے ہیں۔ زندگی کا چراغ موت کی آندھیوں کی زد میں رہا ہے۔ موت سے زیادہ خوفناک شے موت کا ڈر ہے۔ یہ ڈر زندگی کو گھُن کی طرح کھائے چلا جا رہا ہے۔ اِنسان جب یہ سوچتا ہے کہ اُس کی ہر چیز اُس سے چھن جائے گی اور وہ اَعزاء و اَقرباء کو چھوڑ کر خالی ہاتھ کسی نامعلوم منزل کی طرف اکیلا روانہ کر دیا جائے گا، تو وہ خوفزدہ ہو جاتا ہے۔

موت کا عمل تو زندگی کے عمل کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بچپن، بچپن ہی میں مر جاتا ہے۔ جوانی ختم ہو جاتی ہے۔ بینائی کے چراغ مدّھم ہو جاتے ہیں۔ اِنسان کی آنکھوں کے سامنے محبوب اور مانوس چہرے رخصت ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ نقشے، جغرافیے اور تاریخیں

بدل جاتی ہیں۔ آرزوئیں حسرتیں بن جاتی ہیں۔

موت صرف سانس یا آنکھ کے بند ہو جانے کا نام نہیں۔ ہر آرزو کی موت، موت ہے، بلکہ عزیزوں کی موت اپنی موت ہے۔ وابستگی اور تعلق کی موت اپنی موت ہے۔ مقصد مر جائے تو اِنسان مر جاتا ہے۔ بے مقصد زندگی چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، موت سے بدتر ہے۔ بے مقصد انسان بے خوف نہیں ہو سکتا۔ با مقصد اور با معنی زندگی موت کے ڈر سے بے نیاز ہوتی ہے۔

موت کے ڈر کے علاوہ آج کی زندگی کو اور بھی کئی خطرات کا ڈر رہتا ہے۔ ہم اپنے اعمال کی عبرت سے ڈرتے ہیں۔ ہمیں اُس دن سے خوف آتا ہے، جب راز فاش ہوں گے اور بداعمالیاں چہروں پر لکھی جائیں گی، جب مجرم کی زبان خاموش کر دی جائے گی اور مستند گواہیاں اُس کے خلاف رطبُ اللِّسان ہوں گی۔ وہ دِن کسی دِن بھی آ سکتا ہے۔ اِس خوف سے نجات کا راستہ صرف اور صرف توبہ ہے۔

دولت کی محبّت غریبی کا ڈر پیدا کرتی ہے۔ اِنسان اِسی لیے تو دولت جمع کرتا ہے کہ غریبی سے نجات ملے۔ وہ جتنا مال جمع کرتا ہے، اُس سے زیادہ کی خواہش رہتی ہے۔ اِس طرح دولت لوبھ پیدا کرتی ہے اور یہ لوبھ خوف پیدا کرتا ہے۔ لالچ نہ نکلے تو خوف نہیں نکل سکتا۔

"لاخوف"، "لاتَخَفْ" اور "لایَحْزَنُون" کی منزلیں طے کرنے والے مال کی محبّت سے آزاد ہوتے ہیں۔ دولت کی تمنّا کے لیے خوف کا عذاب لکھ دیا گیا ہے۔

ہم اپنے آپ کو جتنا محفوظ کرتے ہیں، اُتنا ہی غیر محفوظ ہونے کا ڈر ہمیں دبوچ لیتا ہے۔ سیکورٹی کی تمنّا، خوف کا دوسرا نام ہے۔

جو اِنسان دوسروں کو خوف زدہ کرتا ہے، وہ خود خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ جو طاقت خوف پیدا کرتی ہے، وہ خود خوف زدہ رہتی ہے۔ طاقت ور کو کمزور ہونے کا خوف کھا جاتا ہے۔ طاقت کا اِستعمال خوف کے ساتھ نفرت بھی پیدا کرتا ہے۔ کمزور اِنسان کی نفرت ہی طاقت ور

کے لیے خوف ہے۔ یہ خوف طاقت کی موت ہے۔

کوئی دنیاوی طاقت ہمیشہ کے لیے طاقت ور نہیں رہ سکتی۔ فرعون کو موسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے ہی خوف لاحق ہو گیا تھا۔ فرعون کی دولت، اُس کا دَبدبہ، اُس کی حکومت اور اُس کے لشکر اُسے ایک بچّے کے خوف سے نہ بچا سکے۔ ایک اِنسان کے خوف نے ایک بادشاہ کو چَین سے بیٹھنے نہ دیا اور آخر کار طاقت غرقِ دریا ہو گئی۔ اِقتدار اور اِختیار کا بے قرار رہنا فطری بات ہے۔

کچھ لوگوں کے لیے ماضی کی یاد خوف پیدا کرتی ہے۔ کچھ لوگ مستقبل کے اندیشوں سے دوچار ہیں۔ خوف موجود لمحے کا تو ہوتا ہی نہیں۔ خوف صرف جانے والے یا آنے والے وقت کا ہوتا ہے۔ گُزرے ہُوئے زمانے کا خوف دراصل آنے والے زمانے کا خوف ہے۔ ماضی صرف اُسی وقت خوفزدہ کرتا ہے، جب اُس کا ناخوشگوار نتیجہ ابھی باقی ہو۔

اُس کی رحمت پر نگاہ رکھی جائے تو خوف ختم ہو جاتا ہے۔ خوف آخر مفروضہ ہی تو ہے۔ وہ اَلمیہ جو ابھی رُونما نہیں ہُوا اور رُونما ہو سکتا ہے، اندیشہ کہلاتا ہے۔ اِنسان اگر مستقبل کو آئینۂ تخیل میں اُتارنے کی بجائے حال کے فرض کا قرض ادا کرے تو خوف سے بچ جاتا ہے۔ مستقبل صرف خواب ہی تو ہے — خوفناک ہو یا حسین، محتاجِ تعبیر ہے، اور ماضی کتنا ہی بھیانک ہو، ایک تصویر ہی تو ہے — بے جان تصویر۔ حال اور صرف حال حقیقت ہے۔ حال زندگی ہے — عمل ہے — خوف سے آزاد۔ جو ہوا، سو ہو چکا۔ جو ہونا ہے، سو ہو جائے گا۔

صرف خوف کسی خطرے کو ٹال نہیں سکتا۔ صرف خوفزدہ رہنے سے تو دُشمن نہیں مرتے۔ عمل کی ضرورت ہے، اور عمل کے لیے خوف سے نجات ضروری ہے۔

اِسی فانی اور مختصر زِندگی میں لوگوں نے خوف سے آزاد رہ کر کارنامے سرانجام دیے، عظیم تخلیقات ہوئیں، تہذیبیں پیدا ہوئیں، عجائبات بنائے گئے، تمدّن پیدا ہوئے اور پُرانے کھنڈرات کے دامن میں نئی عمارتیں بنائی گئیں۔

زندگی صرف خوف زدہ رہنے کے لیے نہیں ملی۔ خوف ترقی سے محروم کر دیتا ہے اور

خوف زدہ اِنسان اپنے اندر ہی ریت کی دیوار کی طرح گر جاتا ہے، اور یوں زندگی ہی میں مر جاتا ہے۔ عظیم اِنسان موت کی وادی سے باوقار ہو کر گزرتے ہیں۔

دراصل کچھ مزاج ہی ایسے ہوتے ہیں جو ہر حال میں ڈرتے ہیں۔ عبادت کریں تو اُس کے نامنظور ہونے کا اُنہیں ڈر رہتا ہے۔ وہ سفر کریں تو حادثات کا خطرہ اُن کے دِل کی دھڑکنیں تیز رکھتا ہے۔ دُھوپ ہو تو اُنہیں دُھوپ سے ڈر لگتا ہے، بارش ہو تو بارش سے۔ وہ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج سے ڈرتے ہیں۔ وہ کسی ناگہانی آفت کی گرفت کے اِمکان سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ اُن کے قلوب کی سرزمین میں ہمہ وقت زلزلے آتے رہتے ہیں۔ وہ ہر وابستگی سے ڈرتے ہیں۔ وہ قربتوں سے بھی ڈرتے ہیں اور فاصلوں سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں۔ اُن کے لیے ہر مشاہدہ خوف پیدا کرتا ہے۔ اندیشوں کی آکاس بیل اُن کی زِندگی کے شجر کو لپیٹ میں لے لیتی ہے اور اُن کی ہستی اُس ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح ہوتی ہے، جسے کوئی ہوا بھی راس نہیں آتی۔

بُزدل اِنسان کو کوئی حالت خوف سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ کوئی نہ کوئی خطرہ اُس کے وجود میں موجود رہتا ہے۔ اُسے دَریا میں ڈوب جانے کا ڈر رہتا ہے، صحرا میں پیاس سے مر جانے کا ڈر رہتا ہے۔ اُسے دُنیا کا ڈر رہتا ہے، عقبیٰ کا ڈر رہتا ہے۔ وہ شاید یہ نہیں جانتا کہ اللہ کی رحمت اُس کے غضب سے وسیع تر ہے۔ یہ زندگی اندیشوں کے لیے نہیں پیدا کی گئی۔ یہ زندگی اُس کی رحمت اور اُس کے فضل کے حصول کے لیے دی گئی ہے۔ راتیں ہمیشہ تاریک نہیں ہوتیں اور کوئی تاریک رات ایسی نہیں جو دِن کے اُجالے میں ختم نہ ہو۔ سورج ضرور طلوع ہوتا ہے — کامرانیوں کا، سرفرازیوں کا۔ اعتماد اور یقین حاصل ہو جائے تو اندیشے ختم ہو جاتے ہیں۔ اعتماد محبّت سے حاصل ہوتا ہے، خدمت سے حاصل ہوتا ہے، عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔

جس زندگی میں شوق ہو گا، اُس میں خوف نہیں ہو گا۔ خوف دوزخ ہے، شوق جنت۔ مفادات کو مُقدّم سمجھنے والے مقامِ شوق نہیں سمجھ سکتے۔ شوق کا تعلق دِل سے ہے، مفادات کا واسطہ دماغ سے ہے۔ دِل قربانیاں پیش کرتا ہے، عقل حاصل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

قربانیاں پیش کرنے والے کو کوئی ڈر نہیں ہوتا اور حاصل کی تمنّا کرنے والا محرومی کے اندیشوں سے نہیں نکل سکتا۔

جب تک یہ زندگی اُس مقصد کے لیے نہ صَرف کی جائے جس مقصد کے لیے اِسے تخلیق کیا گیا ہے، یہ خوف کے عذاب سے نہیں بچ سکتی، اور وہ مقصد خالقِ ہستی نے واضح اور واشگاف الفاظ میں فرمادیا ہے۔

پیدا کرنے والے کی منشا کے خلاف جو زندگی ہوگی، خوف زدہ ہوگی۔ خالق سے دُوری جس شکل میں بھی ہو، ڈر پیدا کرے گی، اور خالق کا قُرب جس حالت میں بھی ہو، خوف سے نجات دے گا۔ فیصلہ انسان نے خود کرنا ہے۔

بات سے بات

بہر حال یہ موسم خود ہی بدلتے ہیں۔ سفر کی تمنّا جب آرام کی خواہش میں بدل جائے تو سمجھ لیجیے کہ ایک نیا موسم آ گیا— سکون کا موسم، آرام کا زمانہ، یادوں کے دن، گھر کے اندر، عبادت کے زمانے، نصیحتوں کا وقت، احتیاط کے ایّام، صحت کا خیال، زندگی کی کارگزاری کا حساب، کردہ اور ناکردہ خطاؤں کی بازگشت—!

اِنسان حیران ہو جاتا ہے کہ وہ اِتنا کیوں بدل گیا۔ دراصل عمر بدل جاتی ہے، خیال خود ہی بدل جاتا ہے— نہ جوانی ہمارا قصور ہے، نہ بُڑھاپا ہماری غلطی۔ یہ سب موسم زندگی کے اپنے موسم ہیں۔ اِن موسموں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔

پھر ایک موسم آتا ہے— آخری پت جھڑ کا موسم۔ لاکھ کوشش کرو، ٹھہر نہیں سکتے۔ دیواریں قائم رہتی ہیں اور مکان اندر سے زمیں بوس ہو جاتا ہے۔ وجود کے اندر کچھ بھی تو موجود نہیں رہتا۔ کہاں گئے سب کرشمے، سب قویٰ، سب رنگ، کیا ہُوا! اِس میں اِنسان کا کیا قصور؟— عظیم پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں—ریت کا ڈھیر!!

اِنسان احتیاط کرے تو بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ کیا اِنسان فصل کی طرح پیدا ہوتا ہے؟ —مولی گاجر کی طرح! موسم سے آیا اور موسم کے دَم سے زِندہ رہا، اور موسم کے ساتھ رخصت ہو گیا؟ کیا اِنسان کچھ بھی نہیں؟ کیا اِنسان اپنے ہونے میں بھی کچھ نہیں ہے؟ کیا انسان ریکارڈ شدہ کیسٹ کی طرح ہے؟ بس چلتا رہا اور پھر ختم ہو گیا؟ کیا سب کچھ کاتبِ تقدیر کا ہے؟ اگر یہ سب کچھ اُس کا ہے تو پھر اِنسان کا کیا ہے؟

اِنسان کو یہی بات تو مشکل معلوم ہوتی ہے۔ آزادی کیا ہے؟ آزادی کتنی ہے؟

مجبوری کیا ہے؟ مجبوری کس حد تک ہے؟

اِنسان کو عقل دی گئی۔ عقل کا اِستعمال بھی ضروری ہے، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ کم عقل یا بے عقل اِنسان بھی عقل کا استعمال کرتا ہے۔ اِس دنیا کی رونقیں عقل کے دَم سے ہیں۔ عقل نے انسان کو ستاروں کی بلندیوں تک پہنچایا ہے، لیکن ستاروں کی گزرگاہوں کو ڈھونڈنے والا اِنسان یہ نہ معلوم کر سکا کہ زِندگی کا راز کیا ہے!

زِندگی رونقوں میں گزرتی ہے اور راز تنہائیوں میں ملتے ہیں۔ راز بتائے نہیں جاتے، رازِ آگہی یا رازِ آشنائی کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اِجتماع کا راز اور ہے اور انسان کا راز اور! اِجتماع ضرورت کے راز میں مبتلا رہتا ہے۔ ضرورتیں پوری کرنا، اِجتماعی مسائل کا حل سوچنا، شہر بنانا، شہری زِندگی کی آسائشوں کا خیال رکھنا، صحت کے لیے شفاخانوں کا انتظام، تعلیم کے لیے سکول کالج بنانا، پانی کا حصول اور پانی کا نکاس، سڑکوں، روشنیوں اور دفتروں کا اہتمام، نیز اخبار، ریڈیو، ٹی وی وغیرہ یہ سب اِجتماعی ضرورت کی باتیں ہیں۔ سفر وغیرہ کی سہولتیں ہر بامعنی معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

اِجتماع اِس بات سے بے خبر اور بے نیاز ہوتا ہے کہ کسی شہر کی ساٹھ لاکھ کی آبادی ساٹھ سال میں مکمل طور پر ختم ہو چکی ہوتی ہے اور اُس کی جگہ نئے لوگ اُتنی بلکہ اُس سے بھی زیادہ تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ شہر وہی رہتے ہیں، شہری بدل جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے کلاس رُوم آج بھی طلبہ سے بھرے ہوتے ہیں، لیکن ہمارے ساتھ پڑھنے والے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے جاتے ہیں، یعنی دُنیا آباد رہتی ہے اور لوگ ختم ہوتے رہتے ہیں۔ ہم زندہ رہیں تو بھی کچھ عرصہ کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ نا آشنا لوگوں میں ہیں۔ آشنا بکھر جاتے ہیں اور نا آشنا موجود پائے جاتے ہیں۔ مل کر رہنے والے الگ الگ رخصت ہوتے ہیں۔ ہسپتال اپنی اہمیت اور افادیّت کے سہارے قائم رہتے ہیں اور ڈاکٹر مریضوں کی جان بچاتے بچاتے خود ہی کسی دن جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اِس سے مَفر نہیں۔

جب جانا لازم ٹھہرا تو ٹھہرنے کے لیے کیا لازم ہے؟ جب سامان لَد ہی جانا ہے تو کتنا سامان درکار ہے؟

اِنسان علم حاصل کرتا ہے، دانائی کا علم۔ دانا لوگوں کی باتیں پڑھتا ہے۔ رُوحانی اور دُنیاوی زندگی کے سپہ سالاروں اور شہسواروں کی زندگی اور اُن کے علوم کی داستانیں، اُن کے ہم عصر اور ہم نواؤں کی گواہی کے قصے پڑھتا ہے تو اِنسان یہ بھول جاتا ہے کہ دانائی کتاب سے حاصل نہیں ہوتی۔ دانا کی زندگی کا علم دانائی نہیں، دانا کی زندگی کا عمل دانائی ہے۔ مثلاً ریت کے تپتے ہوئے صحرا میں عظیم انسان ﷺ کا دیا ہُوا خطبہ، دانائی کا شہکار خطبہ، اگر ہم کسی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر پڑھیں تو ہمیں کتنا فیض ملے گا۔ عمل، عمل کے تابع نہ ہو تو علم، علم کے مطابق نہیں رہتا۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ راز جاننے والے کا عمل ہی راز آشنائی کا ذریعہ ہے۔

اگر موسم بدل جائے تو خیال بدل جاتا ہے۔ شاعروں نے گھنگھور گھٹاؤں کو توبہ شکن کہا ہے۔ سورج سر پر ہو تو سجدہ بھی رَوا نہیں۔ یہ عجب بات ہے کہ اِنسان کی عبادت اوقات کے ساتھ ہے۔ نماز قائم کرنے کا حکم ہے اور اِس کے اوقات مقرر ہیں۔ اِن اوقات کے باہر یا بعد نماز کی اِجازت ہی نہیں۔ فجر کی نماز فجر ہی کو ادا کی جاتی ہے۔ ہمہ حال ایک حال میں رہنے کا عمل اِس لیے مشکل ہے کہ کائنات کی کوئی چیز ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہ سکتی۔

اِنسان ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور وہ ہمیشہ ایک سا ہی رہتا ہے۔ صحت خراب ہو تو کوئی موسم بھی خوشگوار نہیں اور صحت خوشگوار ہو تو کوئی موسم خراب نہیں ہوتا۔

بُرے اِنسان کو ہر وقت بُرائی کا موقع مل جاتا ہے۔ اچھے کو اچھائی میسر آ ہی جاتی ہے۔ ایمان والے ہر حال میں ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ کافر ہر لحہ اپنے کفر پر کاربند رہتا ہے۔ وعدہ شکن کوئی بھی تو وعدہ پورا نہیں کرتا۔ بے وفا، وفا کے بدلے میں ہی تو بے وفائیاں کرتا ہے۔ محبّت والے محبّت کرتے رہتے ہیں۔ اہلِ دِل حضرات ذرّے ذرّے میں دھڑکنیں محسوس کرتے ہیں اور پتھر دِل اِنسانوں کو اِحساس کی دولت سے محروم ہونے کا بھی اِحساس نہیں ہوتا۔ کل کے

دعوے آج کی معذرت بن جاتے ہیں۔ سیاست ہمیشہ میدان میں رہتی ہے اور حکومت ایوان میں۔ غریبوں کی حالت بدلنے کا دعویٰ کرنے والے خود غریبی کے ذائقے سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اِنسان عجب مخلوق ہے۔ خود تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔ اِنسان خود ہی میلہ لگاتا ہے اور خود ہی میلہ دیکھنے نکلتا ہے۔ ہجوم میں ہر اِنسان ہجوم کا حصّہ ہے اور ہر اِنسان اپنے علاوہ اِنسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اِکھٹی ہو جائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔ ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

ایک زندگی کتنے اَدوار سے گزرتی ہے، اِس کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ بچپن کے کھیل، بچپن کے کھلونے، بچپن کے ساتھی، چند دنوں کی بات ہے۔ دن گزر گئے۔ کھیل ختم ہو گئے۔ بچّہ بھول گیا کہ اُس نے کون کون سے کھیل کھیلے۔ کون کون سی آرزوئیں اور تمنّائیں تھیں، بچپن میں۔ بس وہ دن گئے اور وہ باتیں بھی گئیں۔

جوانی آئی۔ اپنے ساتھ نئے تقاضے، نئے ساتھی، نئی تمنّائیں، نئے قہقہے، نئے آنسو، نئے عزائم اور نئے حوصلے لائی۔ پہاڑوں کی سیر، دریاؤں کے کنارے، باغوں کی بہار، سفر کے پروگرام — ہر وقت نئی بات، نئے خیال، نئی کتابیں، محنتیں، تعلیم، حصولِ مراد، غرضیکہ ایک نیا سلسلہ ہے جو جوانی کے نام پر اِنسان پر نازل ہوتا ہے۔ اِنسان چلتا ہے اور چلتا ہی رہتا ہے۔ بلند مقامات، مشکل مراحل، مہم جوئی، محنت طلبی، شعر و شاعری جوانی کے مشاغل ہیں۔ جوانی کھیلتی ہے۔ جوان آدمی جواں ہمت ہوتا ہے۔ جواں دِل ملیں تو موسم بلکہ ہر موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ جوانی دلچسپیوں اور وابستگیوں کے چند طلسماتی ایّام کا نام ہے۔ طلسماتی اِس لیے کہ اِن دنوں میں بڑے رموز آشکار ہوتے ہیں۔ اِنسان کو اپنے آپ میں کئی جلوے نظر آتے ہیں۔ جوانی بدصورتی کو بھی دیدہ زیب بنا دیتی ہے۔ جوانی افکار کی بہار کا موسم ہے۔ جوانی فاصلے طے کرتی ہے — دِلوں کے فاصلے، وقت کے فاصلے، زمانوں کے فاصلے۔ جوانی جامے سے باہر نکلتی ہے، حدود سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ جوانی کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہے — کچھ نہ کچھ — خواہ وہ غلطی

ہی کیوں نہ ہو۔ جوانی موجِ دریا ہے۔ کناروں سے ٹکراتی ہے اور کناروں سے نکل جاتی ہے۔ جوانی اپنے کرشمے دکھاتی رہتی ہے۔ دن کو چہرے دکھاتی ہے اور رات کو تارے دکھاتی ہے۔ جوانی کے پاس ایک انوکھا کرشمہ ہوتا ہے۔ جوانی اِنسان کے خون کی گرمیاں لے کر چپکے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ یہ جوانی کا آخری کرشمہ ہوتا ہے۔

انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ تاروں کی محفل ماند کیوں پڑ گئی۔ وابستگیاں، بے اعتنائیوں میں کیوں بدل گئیں۔ اپنے، اجنبی کیسے ہو گئے۔ اِس میں انسان کا اپنا جُرم یا اپنی خوبی کا دخل نہیں۔ یہ صرف موسم بدلنے کے نتیجے ہیں۔ عمر کا موسم بدل گیا، ذائقے بدل گئے، پروگرام بدل گئے، سرگرمیاں بدل گئیں، سب کچھ بدل گیا— موسم بدلنے کا وقت آجائے تو وقت کا موسم بدل جاتا ہے۔ ہر وِصال فراق سے گزرتا ہے۔ اِنسان اپنی مسرتوں کے زمانوں کی یادیں آنسوؤں سے تحریر کرتا ہے۔ تاج محل جوانی کے غم کی تحریر ہے اور یہ تحریر اتنی دِل پذیر ہے کہ اِس کی جاذبیّت سے اِنسان غم بھول جاتا ہے۔ جوانی کا غم شاعر کے دِل سے گزرے تو یہ غم نوائے سروش بن جاتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ سقراط کا علم جاننے والا، سقراط نہیں بن سکتا۔ اِس لیے کہ سقراط کسی کتاب کو پڑھنے کے بعد سقراط نہیں بنا۔ سیرت پر کتابیں لکھنے والا ضروری نہیں کہ مسلمان ہی ہو۔ غیر مسلموں نے بھی نعت کہی ہے اور بہت اعلیٰ بھی!

آج کا اِنسان راز آشناؤں کو پڑھتا ہے، راز نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا اِنسان محنت کے باوجود سکون سے محروم ہے۔ اُس کا علم تقریباً لامحدود ہے اور عمل تقریباً مفقود۔ لامحدود آرزوئیں محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں۔ آج کا عصری کرب یہی ہے کہ اِنسان کثیر المقاصد ہو کر رہ گیا ہے۔ آج کا اِنسان مذہب سے آزادی چاہتا ہے، اِس لیے کہ مذہب عمل کی دعوت دیتا ہے اور عمل پر کاربند اِنسان انفارمیشن کے بیشتر علوم کو غیر ضروری سمجھنے لگتا ہے۔ آج کا اِنسان مقدّر سے جھگڑا کرتا ہے۔ وہ کسی تقدیر کو ماننا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ وہ خود بناتا ہے

اپنی زندگی — اور زندگی محبّت کی طرح بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ اِنسان مقدّر کو کوستا ہے۔ مانتا بھی نہیں اور چھوڑتا بھی نہیں۔ مقدّر اور اِنسان ہمیشہ اِکٹھے رہتے ہیں اور ہمیشہ جھگڑا کرتے ہیں۔ آزادی کی تمنّا مجبوریوں میں پرورش پارہی ہے۔ یہی راز ہے کہ راز بیان نہیں ہو سکتا۔

دانائی اور حِکمت کا میسّر آنا کسی کوشش یا علم یا عمل کا نتیجہ نہیں۔ مکھی شہد بناتی ہے۔ جگنو روشنی رکھتا ہے۔ اِسی طرح دانا اِنسان دانائی رکھتا ہے۔ پُرانے زمانے میں لائبریریاں تو نہیں تھیں لیکن دانائی تھی۔ کتابیں نہیں تھیں لیکن پیغمبر تھے۔ آسائشیں نہیں تھیں لیکن زندگی پُرسکون تھی۔

دانا کیسے بنتا ہے، کامیابی کیسے آتی ہے، سکون کہاں سے ملتا ہے، خوشی کہاں سے نازل ہوتی ہے، راز کِدھر سے دریافت ہوتا ہے؟ — بس ایسے ہی، جیسے اِنسان بنتا ہے۔ اِنسان کا پیدا ہونا ہی اُس کے نصیب کے پیدا ہونے کے ساتھ ہے۔

کبھی کبھی نیکی بھی ایسے آتی ہے جیسے بارش۔ کبھی کبھی بُرائی ایک راستے کی طرح پاؤں کے نیچے آجاتی ہے۔ رات سے دِن اور دِن سے رات، عزّت ذِلّت، تعیناتی اور معزولی ہوتی ہی رہتی ہے۔

ہم جس پیشے میں آج معزز ہیں، یہ بھی کسی اور رُخ میں ناکامی کا نتیجہ ہے۔ ہم ایک شعبے میں سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اور بھی شعبے ہیں دریافت کرنے والے، تو ہم اُلجھ جاتے ہیں اور یہ اُلجھاؤ خرد کی گُتھیاں کہلاتا ہے۔ وجدان اور جنون نہ ہوں تو گُتھیاں نہیں سلجھتیں۔ مقصدِ حیات، عملِ حیات سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ رازِ ہستی، رونقِ ہستی کے علاوہ بھی ہو سکتا ہے۔ نصیب اور کوشش یکجا بھی ہو سکتے ہیں اور الگ الگ بھی۔ اِنسان اور مقدّر کی صلح بھی ہو سکتی ہے۔ کارزارِ حیات، گلزارِ حیات میں بھی بدل سکتا ہے۔ اگر پیدا ہونے اور مرنے کا اِختیار انسان کو مل جائے تو زندگی بنانے کا اختیار اُس کا اپنا ہے۔ اگر دُنیا کی رونقوں میں میرے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تو مجھے رونقوں سے

کیا حاصل؟

میری اولاد نہ میرے منصب پر فائز ہو سکتی ہے، نہ میرے علم کی وارث — نہ اُس کا خیال مجھ جیسا، نہ اُس کا عمل میرے عمل کے برابر۔ میری اولاد مجھ سے اجنبی ہی رہتی ہے۔ پھر بھی اِس اولاد کے لیے میں کیا کیا جتن کرتا ہوں۔ کہاں کہاں سے کیسے کیسے گزرتا ہوں، کس کے لیے؟ بے حِس کے لیے؟ میں نے جس کے لیے بھی جو کیا، اُسے اِس کا اِحساس نہیں۔ پھر میری زندگی کا مقصد وہ تو نہ ہوا، جو میں نے سمجھا، جو میں نے بنایا۔ میری محنت میرے کام نہ آئی۔ دوسروں کے کیا کام آئی ہو گی۔ پھر بھی میرا دعویٰ ہے کہ میں ہی صحیح ہوں، میرا پیشہ ہی صحیح ہے۔ میری کارروائیاں اور میرے کارنامے ہی عجائباتِ زمانہ میں سے ہیں، لیکن مجھے کون بتائے کہ ایسا نہیں ہے۔ میں کسی کی سنتا نہیں، کسی کی مانتا نہیں — پھر وہ دن آ پہنچتا ہے جب میرے اعمال اپنے نتیجے سے گزر کر میرے سامنے آتے ہیں۔ اپنا اصل چہرہ جب اپنے رُوبرو آتا ہے تو سب دعوے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم وہ نہیں تھے جو ہم بنے ہوئے تھے۔ ہم بہروپ کے سروپ میں گم تھے۔ ہم تعریف سُننے کے لیے جھوٹے مداحوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور جب راز آشنا مل جاتا ہے تو ہم حیرت میں گم ہو جاتے ہیں۔ حیرت میں گم ہونا ہی راز کے سُراغ کا نقشِ اوّل ہے۔ حیرت میں گم ہونا، اپنے آپ میں گم ہونا ہے۔ جو اپنے آپ میں گم ہو گیا، اُس نے اپنا آپ دریافت کر لیا۔ جس نے اپنا آپ دریافت کر لیا اُس نے راز دریافت کر لیا۔ راز کو دریافت کیا جاتا ہے، بتایا اور پوچھا نہیں جاتا۔ جس کو راز مل گیا، اُس نے زندگی میں موت اور موت میں زندگی کو دیکھ لیا۔ قطرہ قلزم آشنا نہ ہو تو قرار کیسے پائے۔ اپنے ہونے کا مقصد اپنے نہ ہونے سے پہلے ہی دریافت کر لیا جائے۔ کم از کم اِتنا تو جان لیا جائے کہ مجھ میں میرا اپنا عمل کس حد تک ہے، اور کسی اور طاقت کا عمل کس حد تک! وہ طاقت اگر مقدّر یا نصیب ہی ہو، تو کیا حرج ہے! حُسنِ تدبیر ہی اگر حُسنِ تقدیر ہو جائے، تو کیا بات ہے!!

ظلم

ظلم کا تعلق مظلوم کے احساس سے ہے۔ کسی ظالم کا کوئی عمل اُس وقت تک ظلم نہیں کہلائے گا، جب تک مظلوم اُس عمل سے پریشان نہ ہو۔ دنیا میں ہونے والے بیشتر مظالم مظلوم کی پسند کا حصّہ بنا دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو مظلوم اُس ظلم کو برداشت کرنا اپنے ایمان کا حصّہ سمجھ لیتا ہے۔

ظالم کا سب سے بڑا ظلم یہی ہے کہ وہ مظلوم کو ظلم سہنے، ظلم میں رہنے کی تعلیم دے چکا ہوتا ہے۔ اَمیر بادشاہ غریب رعایا کو تسلیم، صبر اور رضا کی تعلیم دے کر اپنے مال کو محفوظ کرتا ہے۔ غریب کو صبر کی تلقین کرنے والا خود اَمیر رہنا پسند کرتا ہے۔ ظلم ہوتا رہتا ہے اور کسی کو خبر تو کیا، اِحساس تک نہیں ہوتا۔ اَمیر حکمران اپنے بچوں کو انگریزوں کے سکولوں میں تعلیم دلواتے ہیں اور غریب عوام کو دِین کا حوالہ دے کر سمجھایا جاتا ہے کہ اُن کے بچے کسی دارالعلوم میں تعلیم حاصل کریں۔ درسِ نظامی سے فارغ التحصیل ہو کر غریبوں کے بچے کسی مسجد کے اِمام بن کر اُس کے حُجرے میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اَمیروں کے بچے افسر بن کر حکومت کرتے ہیں۔ ظلم ہوتا رہتا ہے اور کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔ اگر کوئی دانشور اِس ظلم کی نشان دہی کرتا ہے، تو اُسے ملحد و زندیق کہہ کر بدنام کر دیا جاتا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ظلم سہنے والا، ظلم میں رہنے والا، خود بھی ظالم کے ساتھ مل کر، اُس انسان کے خلاف ہو جاتا ہے جو اُسے اُس پر ہونے والے ظلم کی نشان دہی کراتا ہے۔ ظالم اپنے ظلم کو برقرار رکھنے کے لیے بڑے بڑے رُوپ دھارتا ہے۔ کبھی مسیحائی کا رُوپ، کبھی رہنمائی کا بہروپ، کبھی آشنائی کا

انداز، کبھی محبّت کا طلسم، کبھی تعریف کرنے والے کی شکل میں — ظلم بہر حال جاری رہتا ہے۔ آج مسیحائی کی وبا پھیل چکی ہے۔ ہر نا اہل کو زعمِ آگہی ہے۔ قوم پر اِنتشار نازل کرنے والے مسیحاؤں کی کمی نہیں، ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ ڈاکٹروں کی شکل میں ایسے مسیحا موجود ہیں جن کی توجہ مریض کے مرض کی بجائے اُس کی جیب پر ہوتی ہے۔ مسکرا کر اِتنی بات بتانے کے لیے کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں، آپ سے فیس کا مطالبہ ہوتا ہے۔ آپ خوشی سے ظلم سہتے ہوئے رخصت ہوتے ہیں۔ غریب کی بیماری اَمیر ڈاکٹر کے لیے نویدِ بہار ہے۔ ظلم جاری رہتا ہے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ سیاست کے میدان میں راہنما اپنی اَنا کے سفر میں بڑے بڑے ظلم کرتے ہیں۔ عوام کو گمراہ کر کے اُن کی زندگی عذاب بنا دی جاتی ہے۔ ایک اَن پڑھ چھابڑی والے کو سیاست کے میدان کا شہسوار ہونے کی غلط فہمی عطا کر دی جاتی ہے۔ وہ بیچارہ ظلم برداشت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے بین الاقوامی سیاست کا مکمل شعور مل چکا ہے۔ وہ ”امریکہ مردہ باد“ کے نعرے لگاتا ہے اور چھابڑی کو بساطِ سیاست سمجھتا ہے۔ اِس بیچارے پر ظلم ہو چکا ہوتا ہے اور وہ اِس سے آگاہ تک نہیں ہوتا۔ ایک نئے دور کی تمنّا مجبور زندگی کو نئی اذیّتوں سے دوچار کرتی ہے۔ راہنما کرسیوں کے کھیل میں غریب کی عافیت سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ظلم جاری رہتا ہے اور مظلوم کو اِحساس تک نہیں ہوتا۔

کچھ علمائے دین زندگی کی بے معنویت کو اِس حد تک بیان کرتے ہیں کہ محنت، کوشش، مجاہدہ اور سعی کی لگن چھن جاتی ہے۔ علم کا ظلم سب سے زیادہ ہے۔ عذاب ہے وہ علم جو اِنسان کے کام نہ آئے — ظالم یہ عذاب مسلط کرتا ہے اور مظلوم اِسے تعلیم کی ضرورت سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ تعلیم حاصل ہوتی ہے اور ضرورت پوری نہیں ہوتی۔ تعلیم کا زیور گلے میں یوں لٹکتا ہے جیسے بَیل کے گلے میں گھنٹی۔ وہ گھنٹی کی آواز سنتا ہے، خوش ہوتا ہے اور ظالم کی زمین میں ہَل چلاتا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ تعلیم ہے تو روزگار کیوں نہیں؟ روزگار تعلیم سے نہیں، تعلقات سے نصیب ہوتا ہے۔ بے معنی تعلیم بدنصیب کا مقدّر بن جاتی ہے۔ اِس ظلم کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

بہت خطرناک ظالم، زندگی میں دوست بن کر آتا ہے۔ ایسے ظالم سے بچنا بہت مشکل ہے جس کے پاس محبّت کی تلوار ہو۔ وہ معصوم دِلوں کو محبّت کے دام میں گرفتار کرتا ہے، اُن سے کام لیتا ہے، کام نکالتا ہے اور پھر ایک نامعلوم موڑ پر اُنہیں حوادثِ زمانہ کے حوالے کر کے شیطان کی طرح مسکراتا ہوا رخصت ہو جاتا ہے۔ ایسے ظالم کے لیے بد دعا بھی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنا تھا۔ اپنا بنا ہوا تھا۔ اُس کے پرانے خطوط ابھی محفوظ ہوتے ہیں اور وہ ہر اِخلاق کے قوانین کو بالائے طاق رکھتا ہوا جھٹک کر چلا جاتا ہے۔ ہم جس کی تعریف کر چکے ہوں، اُس کے ظلم کا بیان کس مُنہ سے کریں۔ بس ظلم ہو گیا لیکن مظلوم ہمیشہ کے لیے خاموش رہ گیا۔

دراصل کسی شے سے اُس کی فطرت کے خلاف کام لینا ظلم ہے۔ جو شے جس کام کے لیے تخلیق کی گئی ہے، اُس سے وہی کام لینا چاہیے۔ اِس کے برعکس ظلم ہے۔ کسی اِنسان سے اُس کے مزاج کے خلاف کام لینا ظلم ہے، جبر ہے۔ اِس سے اِنسان کے اندر ایک حبس کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اُس پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور پھر یہ جمود اندر ہی اندر لاوے کی طرح کھَولتا ہے اور پھر کسی نامعلوم لمحے میں اُبل کر لاوا باہر آجاتا ہے اور ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تباہ کر دیتا ہے۔ مظلوم کی خاموشی ظالم کی عبرت کی اِبتدا ہے۔ خاموش مظلوم خاموش طوفان کی طرح بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کسی انسان سے اُس کے معاوضے سے زیادہ کام لینے کا نام بھی ظلم ہے۔ معاوضہ، دینے والے کی ہستی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ سب سے بڑا ظلم کسی کی محنت کو رائیگاں کرنا ہے۔

کسی انسان میں وسوسہ پیدا کرنا بھی ظلم ہے۔ قوم کو تذبذب میں گرفتار کرنا ظلمِ عظیم ہے۔ کسی راہی کو سفر کے دوران میں اُس کی مسافرت سے بیزار کرنا ظلم ہے۔ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد یہ سوچنا کہ ہمیں کس سفر پر روانہ ہونا ہے، ظلم ہے۔

کسی غریب کی عزتِ نفس کو غریب سمجھنا اُس پر ظلم ہے۔ ظلم کی صورتیں بے شمار ہیں۔ مظلوم کی صورت ایک ہی ہے— غریب، سادہ، معصوم، شریف النّفس، سادہ لوح، جلد مان لینے والا، اپنا حق ترک کر دینے والا، سب کے لیے دعا کرنے والا، اور اُس کی دُعا کی وجہ

سے ہی تو ظالم قائم رہتا ہے — نہ مظلوم کا مزاج بدلتا ہے، نہ ظالم کا۔ یوں ظلم جاری رہتا ہے۔ مظلوم ظلم کو مقدّر سمجھتا ہے اور ظالم اِسے اپنی دانائی! دونوں اپنے اپنے مدار میں قائم رہتے ہیں، لیکن کبھی کبھی تقدیر اپنے نام سے ہونے والے ظلم کو دُور کرنے کے لیے مظلوم کی آنکھوں سے پردہ ہٹاتی ہے اور پھر مظلوم اپنے غصب شدہ حقوق کے حصول کے لیے میدانِ عمل میں اُترتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے مظلوم ظالم کی کرسی پر بیٹھتا ہے اور ظالم کے لباس میں نظر آتا ہے اور ایک بار پھر ظلم جاری ہو جاتا ہے۔ ظلم بہرحال ہوتا رہتا ہے اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔

ظلم کا پہیہ اُس وقت تک جام نہیں ہوتا، جب تک معاف کرنے اور معافی مانگنے کا حوصلہ اور شعور نہ پیدا ہو۔ بدلہ لینے کی تمنّا ظلم کی اَساس ہے۔ معاف کر دینے کی آرزو ظلم کا خاتمہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ ظلم چھوڑنے والے، پرانی باتوں کو چھوڑنے والے ہوتے ہیں۔ ظلم کے ساتھ، ظالم کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے، پیغمبروں کی زندگی سے معلوم ہوتا ہے۔ بھائیوں نے یوسفؑ کے ساتھ جو سلوک کیا، اُس کا بدلہ یہی تھا کہ "جاؤ! آج کے دن تمہارے لیے کوئی سزا نہیں"۔ فتحِ مکّہ کے بعد آپ ﷺ کا پرانے مخالفین کے لیے یہی ارشاد تھا کہ "جاؤ! تم سب کے لیے آج کوئی سزا نہیں"۔

اگر معاشرے میں معافی مانگنے اور معاف کرنے کا عمل شروع ہو جائے تو ظلم کا عمل رُک جاتا ہے۔ خود پسندی ترک ہو جائے تو ظلم رُک جاتا ہے۔ اَنا کا سفر ختم ہو جائے تو ظلم کا سفر ختم ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ سے معافی کا خواستگار ہے، اُسے سب کو معاف کر دینا چاہیے۔ جس نے معاف کیا، وہ معاف کر دیا جائے گا۔ دوسروں پر احسان کرنے سے ظلم کی یاد ختم ہو جاتی ہے۔ حق والے کا حق ادا کر دو، بلکہ اُسے حق سے بھی ماسوا دو، بس اِتنے سے عمل سے ظلم ختم ہو جائے گا۔ جس معاشرے میں مظلوم اور محروم نہ ہوں، وہی معاشرہ فلاحی ہے۔

کرب ہی کرب

مکان بنایا گیا— خوبصورت، بہت ہی خوبصورت— دیکھنے والے خوش ہو گئے۔ سوچنا پڑے گا کہ اگر دیکھنے والے خوش ہوں تو کیا اِس مکان میں رہنے والے لازمی طور پر خوش ہوں گے!

خوش کرنے والا ضروری تو نہیں کہ خوش رہنے والا بھی ہو— پھر یہ سب کیا ہے؟ ہم کیا کر رہے ہیں—؟ اگر ہم خوش ہوں تو لوگ خوش نہیں رہنے دیتے اور اگر لوگوں کو خوش رکھا جائے تو ہم— رہتے ہی نہیں، خوش کہاں سے رہیں گے!

کیا لوگ ہمارے مقدّر کا غیر معاون حصہ تو نہیں! ہر آدمی اپنے علاوہ گروہ کو لوگ کہتا ہے، خود بھی اُسی گروہ میں شامل ہے لیکن وہ خود کو شامل نہیں سمجھتا۔ خود کو کردار سمجھتا ہے اور دوسروں کو کردار کُش—! ہم سب ایک سمت کو چل رہے ہیں اور سب کا رُخ الگ الگ ہے۔ سب، سب سے نالاں ہیں— سب، سب سے اجنبی ہیں— سب، سب سے بیزار ہیں— سب، سب کے ہمراہ ہیں اور سب، سب سے جدا ہیں— سب کے سب مشکل میں ہیں اور سب کے سب بھاگ رہے ہیں اور کوئی کسی کو راستہ نہیں دیتا۔ سب بظاہر متحرک اِنسان ایک ظالم جمود اور تعطل کا شکار ہیں۔ سب بِھیڑ میں شامل ہیں اور سارے اکیلے ہیں۔ ہم سب اکیلے ہیں— اور اِس دنیا میں اکیلے لوگوں کے ہی میلے ہیں— سب سوچ رہے ہیں کہ آخر سوچ مفلوج کیوں ہے؟ کیا لوگوں کو نفرت سے محبت ہے یا محبّت سے نفرت ہے؟ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ سب کو سب کی نظر لگ گئی ہے اور سارے منظورِ نظر بننے کے آرزومند ہیں، لیکن کس کے— ایسا کوئی

نظر نہیں آتا!! عجب حال ہے۔

ہمیں لاشعوری طور پر کسی شدید خطرے کا احساس ہے۔ ہم اِسی لیے بھاگ رہے ہیں، لیکن خطرہ کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ خطرہ ہمارے پیچھے بھاگتا ہے— نہیں— خطرہ تو ہمارے ساتھ بھاگ رہا ہے— ہمارے ہمراہ ہے— ہمارے سامنے ہے۔ ہم اپنے لیے خود ہی خطرہ ہیں۔ ہم خود ہی اپنے محبوب ہیں اور خود ہی حاسد ہیں۔ ہم اپنے ہی سب سے بڑے دوست ہیں اور خود ہی سب سے بڑے دشمن!

ہم بڑے کرب میں ہیں۔ کرب ہمارے دَور کی سب سے قوی علامت ہے۔ ہم نے خود ہی ایک ملک بنایا اور خود ہی سوچ رہے ہیں کہ ہم نے اِسے کیوں بنایا!

ہم کہتے ہیں کہ ہم نے اِسے اِسلام کے لیے بنایا— عجب بات ہے— صحیح بات ہے۔ بنانے والے مسلمان تھے۔ کتنے بڑے مسلمان تھے جنھوں نے ملک بنایا اور کتنا بڑا تھا اِس قافلے کا سالار— بڑا اور سچا مسلمان— لیکن کچھ اسلامی گروہ مخالف تھے۔ کون صحیح مسلمان تھا؟ بنانے والا یا مخالف—؟ کتنا اِسلام چاہیے پاکستان کو قائم رکھنے کے لیے— جتنا قائدِاعظمؒ کے پاس اِسلام تھا۔ اِس سے زیادہ یا اِس کے علاوہ اِسلام کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ضرورت ہے تو قائدِاعظمؒ کی اِسلام کے حوالے سے کیا افادیت ہے؟ اُس کا اِسلامی تشخص کیا ہے؟ ہمارے خیال میں وہ تشخص مکمل ہے، اسلامی ہے۔ پاکستان بنانے کی حد تک تو اسلام آج سے نصف صدی پہلے ہی موجود تھا، اب مزید موجودگی کیا ہے۔ غور طلب بات ہے پاکستان کی خاطر جان دینے والوں کا ایمان مکمل نہ ہو تو اُن کی موت شہادت نہیں ہے۔ اگر شہادت ہے تو وہ ایمان کامل ہو سکتا ہے۔ جس اِسلام نے وحدتِ عمل پیدا کی، وہی اِسلام برحق تھا۔ وحدتِ فکر اقبالؒ نے پیدا کی، اُس کا اِسلام برحق تھا۔ اب اور کیا چاہیے؟

جس بات سے قوم میں وحدتِ عمل پیدا نہ ہو، وہ اِسلام تو نہیں ہو سکتا— علماء صاحبان فیصلہ کریں— ورنہ کربِ مسلسل رہے گا، لوگ اذیّت میں مبتلا رہیں گے۔ جس اِسلام

نے مُلک بنایا، اب اُسی اِسلام سے ہی اِس کی بقا قائم ہو سکتی ہے! کچھ لوگ کہتے ہیں اور سچ ہی تو کہتے ہیں کہ قیامِ پاکستان جمہوریت کے لیے تھا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے مُلک بنایا—بجا—درست — یہ اکثریت، ہندو اکثریت میں اقلیت تھی یعنی اقلیت کے اکثریتی فیصلے سے ملک بنا —عجب بات ہے اقلیت کا اکثریتی فیصلہ —بڑا طاقتور ہوتا ہے—خدا نہ کرے آئندہ بھی ایسا ہو —ممکن ہے ایسا ہی ہو! بہر حال کرب کا عالم ہے۔ صاحبانِ فکر بڑے کرب میں ہیں کہ جمہوریت کے داعی حکومت میں بھی ہیں اور جمہوریت کے پرستار سڑکوں پر بھی ہیں—اصل جمہوریت کے طالب کون ہیں؟ جمہوریت ہی جمہوریت ہے۔ کرب ہی کرب ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

ہمیں ہر طرف سے خطرہ ہے۔ آخر کیوں ہے؟ ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم ڈر رہے ہیں، ہم کیوں ڈر رہے ہیں؟ ہمیں ڈر سے نجات دلانے کے داعی خود تو نہیں ڈر رہے؟ نہیں نہیں، ایسے نہیں ہو سکتا—ممکن ہے ایسے ہی ہو، خدا کرے ایسے نہ ہو!! لیکن —لیکن کچھ نہیں—!!

ہم نے کامیابی کا معیار ہی غلط بنا رکھا ہے۔ ہم طاقت، شہرت، دولت، مرتبے کو کامیابی کہتے ہیں۔ کامیابی یہ تو نہیں۔ کیا ہم نے آخرت پر ایمان چھوڑ دیا— ممکن ہے ایسے ہی ہو —کامیابی مغرب کی تقلید میں نہیں—کامیابی تو اللہ کے حبیب ﷺ کے تقرّب میں ہے۔ ہم بھول گئے۔ شاید ہم خدا پر بھروسہ کرنے کے بجائے ووٹ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ووٹ گنتی کا نام ہے، وزن کرنے اور تولنے کا نام نہیں۔ جھوٹے لوگوں کے ووٹ سے سچا انسان کیسے آ گے آسکتا ہے، اور یہ بھی سچ ہے کہ ووٹ کے بغیر سچا آدمی کیسے سامنے آسکتا ہے۔ صداقتیں شہید ہوتی رہتی ہیں—اب یہ سلسلہ ختم ہو جانا چاہیے۔ صداقت کے سرفراز ہونے کا وقت کب آئے گا؟ آئے گا—ضرور آئے گا—لیکن کب—لیکن—کچھ نہیں۔ خاموشی سے کرب برداشت کرتے چلو—بولنے سے بات اُلجھ جاتی ہے۔ بات کو اُلجھنا نہیں چاہیے، لہٰذا کرب بہتر ہے۔ اِسے

اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیا جائے — کیسے کریں؟ کرب ناک بات ہے۔ اللہ زمین اور آسمانوں کا مالک ہے۔ اُس کی مسجد کے لیے چندہ چاہیے؟ کلمۂ کفر ہے — لیکن ہے۔ خدا ہمیں ہمارے شر سے محفوظ کرے۔ خدا ہمارے دل میں پیدا ہونے والے شبہات کو غرق کرے۔ کوئی ایسا سیلاب جو ہمارے اندیشوں کو بہالے جائے — لیکن سیلاب — خدا کرے، سیلاب نہ آئے۔ سیلاب بُری شے ہے۔ اندیشوں کے ساتھ ہی گزر کریں گے — آخر ہم عادی ہو چکے ہیں۔ ہم اندیشوں کی چادر بنائیں گے اور پھر اِس چادر کو تان کر سو جائیں گے۔ ہم خواب اور خیال کے پرستار ہیں۔ اے اللہ! ہمیں اچھے اچھے خواب دکھا — ہم حقیقت اور حقائق دیکھنے اور سوچنے کے کرب سے نجات چاہتے ہیں۔ یا اللہ! ہمیں نجات دے!!

رِفعتِ خیال

رِفعتِ خیال پستیٔ حیات میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ پاکیزگیٔ افکار کے لیے پاکیزگیٔ کردار کا ہونا لازمی ہے۔ حُسنِ خیال کسی کوشش کا نام نہیں، کسی جستجو کا مقام نہیں، محض تمنّائے تخیل یا حصولِ تخیل کا ذریعہ نہیں۔ اَرفع خیال عنایت ہے، عطا ہے، فضل ہے اور یہ عطا گنہگار اور خطاکار کے لیے قطعاً نہیں— لطافتِ خیال کو اگر جبریل کہہ دیا جائے تو نزولِ افکارِ عالیہ یا نزولِ جبریل کسی کافر یا گمراہ کے لیے نہیں۔ جبریل ماننے والوں اور مقدّس نفوس کو دولتِ اَفکار کے خزانے مہیا کرتا ہے۔ ناپاک زندگی پاکیزہ خیال سے محروم رہتی ہے۔

رِفعتِ خیال کو جاننے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ پستیٔ حیات کیا ہے؟ وہ کون سا اندازِ حیات ہے جس کے نصیب میں تخیل کی بلندی یا رِفعتِ خیال نہیں ہے۔

لالچ یا لوبھ انسان کی زندگی کو پست کر دیتا ہے۔ اَشیاء کا حصول، مال کی تمنّا، مرتبوں کی حسرت، اِنسان کو اور اِنسان کے باطن کو صحرا کی ویرانیاں عطا کرتے ہیں۔ لالچ زدہ دِل ہمیشہ خوف زدہ رہے گا۔ خوف کبھی بلند پرواز نہیں ہو سکتا۔ لالچ ظاہر کی زندگی پر زور دیتا ہے اور خیال باطن کا عروج ہے۔ لالچی انسان کے نصیب میں باطن آشنائی نہیں ہوتی۔ اشیاء کا حصول، اَشیاء کی محبّت، اشیاء کی نمائش، اشیاء کا غرور فنا کے دیس کی باتیں ہیں اور بلند افکار یا بلندیٔ نگاہ بقا کی بستی کے نشانات ہیں۔ فنا، فنا ہے، بقا، بقا— یعنی خیال کی بلندی بقا کی دنیا ہے اور بقا کا سفر اُس وقت تک ناممکن ہے، جب تک فنا اور فنا کی محبّت سے آزادی نہ حاصل کر لی جائے۔

جب اِنسانوں کا گھر سامان سے بھرا ہوا ہو، دِل تمنّاؤں سے بھرا ہوا ہو، پیٹ خوراک

سے بھرا ہوا ہو تو ایسی حالت میں ذہن کا خالی ہونا لازمی ہے۔ پیسہ گننے والا، خیال کی بلندیوں کو کیا جانے۔ بلند خیال انسان اشیاء کے حصول اور اپنے حصول پر غرور سے آزاد ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مکان اپنے مکینوں کی پہچان ہے تو مکین مر چکے ہیں۔ اُن کا ہونا، نہ ہونے کے برابر ہے۔ اُن کا اپنا مکان اُن کے اپنے آپ سے زیادہ اہم ہے۔ اُن کا حاصل اُن کی اپنی زندگی سے زیادہ ضروری ہے۔ بس یہی رکاوٹ ہے بلند خیالی میں —! بلند خیال انسان اپنے مکان کی خود پہچان ہے۔ وہ جہاں بھی رہے، وہ جگہ اُس کے دَم سے پہچانی جائے گی۔ بلند خیال مکین اپنے مکان کی خود ہی زینت ہے۔ اُسے کسی اور شے کی ضرورت نہیں، جس سے مکان کو سجایا جائے۔ اُس نے اپنے مکان کو اپنی ذات سے عزت بخشی اور اپنے آپ کو بلند خیالی سے معزز کیا۔ وہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے کسی اور دُنیا میں رہتا ہے۔ پست خیال اِنسان اپنے وجود کو پالتا ہے اور بلند خیال اِنسان اپنے وجود کو اُجالتا ہے۔ وہ خود سوزِ دوام کے سفر پر رہتا ہے۔

پست خیال اِنسان آکاس بیل کی طرح خود پھیلتا ہے اور دُوسروں کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ وہ دُوسروں کو اُن کے حقوق سے محروم کر کے اپنے نفس کی تسکین چاہتا ہے۔ بلند خیال اِنسان شمع کی طرح جلتا ہے اور روشنی دیتا ہے — جلتا ہے، روشن رہتا ہے۔ بلند خیالی روشنی ہے۔ وہ روشن رہتا ہے، روشن کرتا ہے اور پھر اپنے اصل کی طرف، یعنی نور کی طرف، رجوع کر جاتا ہے۔ اُس کی زندگی دُوسروں کے لیے ہے اور دُوسروں کا دُکھ اپنے لیے۔ وہ بلند خیال ہے۔ پست خیال کو ہم خیال بنانا اُس کا دِین ہے، اُس کا مذہب ہے، اُس کا منصب ہے۔

ہر پست خیال خود غرض ہوتا ہے اور ہر بلند خیال بے غرض! بہر حال حصول اور وصول کی تمنّا اِنسان کو پستی میں جکڑ دیتی ہے۔ پست اِنسان سے اگر اللہ پوچھے کہ تم کو بہشت میں بھیجوں یا دوزخ میں تو فوراً کہہ اُٹھے گا: ”جناب! جہاں دو پیسے کا فائدہ ہو، وہیں بھیج دو!!“ ”فائدہ“ پست اِنسان کا پسندیدہ شغل ہے۔ وہ ہر بات میں فائدہ تلاش کرتا ہے، ہر کام میں فائدہ!! وہ فائدے حاصل کرتا رہتا ہے اور زندگی ضائع! فوری فائدہ اُس کو اصل فائدے سے متعارف ہی نہیں ہونے دیتا۔ اصل فائدہ — زندگی آسان ہو، سادہ ہو، پُرسکون ہو، اندیشوں سے آزاد

ہو، دشمنوں سے نجات ہو، زندگی بھی آسان ہو اور موت بھی آسان، یہ زندگی بھی آسان اور وہ زندگی بھی آسان ——!

پستیِ اَفکار مابعد کو فراموش کر دیتی ہے۔ انسان اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہے لیکن مستقبل قریب، یعنی اپنے ہونے تک کا مستقبل —— حالانکہ اُس کا مستقبل، اُس کا قریب کا مستقبل، اُس کا مابعد، قریب کا مابعد، اُس کی اولاد بھی ہے۔

اَولاد بھی اِنسان کا مابعد ہے، قریب کا مابعد۔ بلند خیال اِنسان اپنے اِس مابعد کو بھی توجہ دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بلند خیال یا بلندیِ خیال یا رفعتِ خیال وراثت نہیں چھوڑتا، لیکن بلند فکری کا اصل نقطہ اصلاحِ فکر ہے۔ صاحبِ خیال اپنی اولاد سے مقابلہ نہیں کرتا —— حصولِ اشیاء کا مقابلہ۔ وہ اپنی اولاد کو دعوتِ نگاہ دیتا ہے، دعوتِ خیال دیتا ہے۔ اَولاد کو اُس کی فطری صلاحیتوں کے بیدار کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اگر بیٹا باپ کی فکر، باپ کے تخیل اور باپ کے حُسنِ خیال کا شاہد نہ ہو تو دونوں کا مابعد خطرے میں ہے، لیکن ایک استثناء کے ساتھ۔ اگر باپ نوحؑ ہو تو بیٹا —— باپ کے حسنِ خیال سے محروم بیٹا —— طوفان کی نذر ہو گا۔ باپ کی دُعا اُسے بچا نہیں سکتی! اگر بیٹا ابراہیمؑ ہو تو اپنے حُسنِ خیال کے وثوق سے باپ کو دعوت دے اور اِنکار کی صورت میں صنم خانۂ آذری تباہ و برباد ہو جائے!

بہر حال حُسنِ خیال دعوتِ خیال ہے اور یہ دعوت محبّت اور ہمدردی سے دی جاتی ہے۔ لوگوں کو آنے والے زمانوں کی طرف اِشارے کیے جاتے ہیں۔ گزرے ہوئے زمانے دُہرا کر سنائے جاتے ہیں۔ لوگوں کی ہوس پرستی اور ذات پرستی، یعنی خود پرستی کے خوف ناک نتائج سے آگاہ کرنا بلند نظری کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ غیروں کو محبّت سے دعوت دی جاتی ہے۔ اپنوں کو صرف اطلاع ہی کافی ہے، اور اگر اپنے قبول نہ کریں تو اپنے —— کیسے اپنے! جدا کر دیے جاتے ہیں!! بہر حال بلند خیالی کی بات ہو رہی ہے۔ بلند خیالی کی وضاحت کیا ہے؟ وہ کیا شے ہے، جسے بلند خیالی کہا جا سکتا ہے؟

کیا بلند خیالی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر آسمان کی باتیں سوچی جائیں؟ نہیں، قطعاً نہیں،

بلکہ اِس کے بالکل برعکس بلند خیالی یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر یہ نہ بھولنا کہ ہم زمین پر بیٹھے ہیں اور زمین پر بیٹھنے والے خواہ کتنا ہی اکڑ اکڑ کر چلیں، آخر زمین کے اندر سما جاتے ہیں۔ مطلب یہ نہیں کہ ہم زمین پر چلنا چھوڑ دیں، اِس لیے کہ اِس کے اندر سما جانا ہے، نہیں، قطعاً نہیں۔ صاحبانِ خیال اپنے اعمال کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ اتنا بوجھ اٹھاتے ہیں جس سے سفر آسان رہے۔ ہر شے ہر وقت حاصل کرنے کی تمنّا لاحاصل ہے۔رفعتِ خیال ایثار میں پلتی ہے۔ ایثار، دراصل فروغِ خیال کا واحد ذریعہ ہے — مجبوری ہے۔

مجبوری یہ ہے کہ رفعتِ خیال خوش خیالی یا خوش فہمی نہیں ہے۔ رفعتِ خیال اظہار میں ضرور آتی ہے اور اِس اظہار سے لوگوں کے لیے منفعت ہے۔ صاحبِ خیال کے لیے خیال صرف سوز ہے، وجدان ہے۔ خیال، خیال نہیں ہے، جذبہ ہے۔ سورج کے پاس دُنیا کے لیے روشنی ہے، اپنے لیے آگ — آگ — اَلاؤ — تپش — سوز — جلنا اور مسلسل جلنا! — تو مجبوری یہ ہے کہ اگر اِنسان بخیل ہو تو اُسے رفعتِ خیال کیسے مل سکتی ہے۔ اُسے سورج کون بنائے گا جو روشنی دینے سے اِنکار کرے! مزاج میں سخاوت اور ایثار نہ ہو تو کبھی رفعتِ خیال نہیں مل سکتی — ! رفعتِ خیال اپنے پاس رہے تو خیال نہیں رہتا۔ اپنا خیال دینے سے اپنا کہلاتا ہے۔

مجبوری یہ ہے کہ زندگی کے تمام اثاثوں میں، تمام خوبیوں میں، تمام حاصل میں سب سے قیمتی، سب سے اعلیٰ شے حسنِ خیال ہے۔ جو شخص کسی کو اپنا مال، جو خیال کے مقابلے میں کم تر اَثاثہ ہے، نہیں دے سکتا، وہ کسی کو بلند خیالی کیسے دے گا! — اور بلندئ خیال نہ دینے والا بلندئ خیال رکھ نہیں سکتا، یعنی جس کے مزاج میں دینا نہیں ہے، اُس کے نصیب میں بلند خیالی نہیں۔ تم مال تقسیم نہیں کرتے، خیال کیسے بانٹو گے؟ — یہی مجبوری ہے اور اِس کا علاج یہ ہے کہ اپنے حاصل کو تقسیم کرو، اپنے حال میں شریک کرو، اپنے آپ کو دُوسروں کے لیے سمجھو — یعنی جو تم نے دیا وہ تمہاری بلندی ہے۔ جو تم لیتے ہو، جمع کرتے ہو، جس کا اپنی ذات تک استعمال رکھتے ہو، جس پر مغرور ہو، جس حاصل سے لوگوں کو افسردہ کرتے ہو، جس مرتبے سے اُنہیں ڈراتے ہو، جس علم کے ذریعے لوگوں کو پریشان کرتے ہو، سب خود

غرضی ہے، سب پست خیالی ہے، کیونکہ بلند خیالی ایثار ہے — روشنی دینا اور آگ میں جلنا —!

بلند خیال لوگ فطرت کے انوکھے شہکار ہیں۔ اُن کو الگ رازِ ہستی ملا، اُن کو نئے معنی ملے، زندگی کے! اُن کو حاصل اور محرومی کے نئے رُخ سے آشنائی ہوئی۔ بلند خیال کامیابی اور ناکامی کے مفہوم، حقیقی مفہوم سے آشنا ہوتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کسی مقصد میں کامیاب ہونا، زندگی کی کامیابی تو نہیں۔ گناہ میں کامیابی، زندگی میں ناکامی ہے۔ ایک سخی غریب صاحبِ خیال ہو سکتا ہے اور ایک بخیل اَمیر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محرومِ خیال —!

بہر حال رفعتِ خیال کی تمنّا ہو تو مال اور مرتبے کی آرزو سے نجات ضروری ہے۔ لذّتِ وجود سے گریز کرنے والے رفعتِ خیال سے آشنا کرائے جاتے ہیں۔ دُوسروں کے دَرد کو اپنا دَرد سمجھنے والوں کو بلند خیال عطا کیا جاتا ہے۔ خدمتِ اِنسانیت کے مخلص جذبے کو فطرت خود خیال کے زیور سے آراستہ کرتی ہے۔ بلند خیالی اِنسان کا وہ حاصل ہے جو کوشش سے نہیں، نصیب سے ملتا ہے۔ بلند خیال اِنسان خاک نشیں ہو، تب بھی عرش نشیں ہے۔ رفعتِ خیال چونکہ عطا ہے، اِس لیے صاحبِ خیال ہمیشہ عطا ہی کرتا ہے۔ اگر کمائی ہوتی تو ہمیشہ سنبھال کر رکھی جاتی۔ اگر سامان ہوتا تو سجایا جاتا۔ اگر مرتبہ ہوتا تو لوگوں کو ڈرایا جاتا، لیکن یہ تو عطا ہے — دینے والے کا عمل، دینے والے نے دینے کے لیے دیا۔ پس! دینے والوں کو اور ایثار کرنے والوں کو بلند خیالی اِس لیے ملی کہ وہ خود چراغ کی طرح جلیں اور روشنی بانٹیں۔ بخیل، مطلب پرست، طالبِ زر سوچتے جائیں کہ یہ سب کیا ہے؟ بس خیال ہی تو ہے، رفعتِ خیال ہو تو کیا ہے؟ رفعتِ خیال نعمتِ پروردگار ہے۔ زندگی میں حاصل ہونے والا اور زندگی کے بعد بھی رہنے والا سرمایہ یہی رفعتِ خیال ہی تو ہے۔

بارِ تسلیم

ایک محدود اور مختصر زندگی میں اِنسان کس کس کی لاج نبھائے۔ سب واجب الاحترام ہیں۔ سب لائقِ تعظیم ہیں۔ سب صاحبِ ارشاد ہیں۔ سب قابلِ تقلید ہیں، لیکن مجبوری تو یہ ہے کہ عرصۂ حیات ہی قلیل ہے۔ اِس میں اِتنی تسلیمات اور اِتنی اطاعتوں کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہم پر کثرتِ قائدین کا خوفناک تسلّط ہے۔ کثیر المقصدیت کا شدید دباؤ ہے۔ ہم پر اعصاب شکنی کی وبا نازل ہو چکی ہے۔ مجبوریوں کے حِصار میں جکڑے ہوئے اِنسان پر اطاعتوں کی یلغار ہے۔ اِنسان جائے تو کہاں جائے!

اللہ کے احکامات ہی لیجیے۔ اللہ کے احکام تو بس اللہ کے احکام ہیں۔ اِرشاداتِ باری تعالیٰ ایک زندگی کے لیے بس کافی ہیں۔ اَوامر و نواہی کا سلسلہ، سلسلہ ہائے روز و شب سے زیادہ ہے اور زندگی ہے کہ گردشِ روزگار کی چکّی میں ہے۔

آج کے دَور میں ایک اِنسان بے شمار طاقتوں کے سامنے جوابدہ ہے۔ وہ کرے تو کیا کرے! اپنی اِصلاح کی طرف توجہ کرے، اپنے باطن کی سیاہیوں کو دُور کرے، اپنے پیٹ کی آگ کو بجھائے، اپنی پیشانی کو سجدوں سے سرفراز کرے، اپنی راتوں کو قیام و رکوع و سجود کی دولت سے مالا مال کرے — اگر کسی طریقے سے ایسا کر ہی لے تو اُسے رمُوزِ مملکت سے آشنائی کیسے ہو۔ ”درویش“ سربراہ بالعموم مخلوق کو خالق کے حوالے کر کے اپنی عاقبت کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ ”اللہ والے“ اکثر مخلوق سے ایسے بے نیاز سے ہو جاتے ہیں جیسے خدانہ کرے وہ

مخلوق کے خالق ہوں۔ بے نیازی خالق ہی کو زیب دیتی ہے کیونکہ وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں۔ سربراہ بے نیاز ہو جائیں تو اُنہیں غافل سربراہ کہا جاتا ہے اور غافل سُلطان رعایا پر ایک آزمائش کی گھڑی ہوتا ہے۔

مشکل تو یہ ہے کہ خدا کو راضی کرنا الگ بات ہے اور مخلوق کو راضی کرنا اور شے ہے۔ دونوں کو بیک وقت راضی رکھنا بہت مشکل ہے۔ جب تک حالات یکساں نہ ہوں، تسلیم یکساں نہیں ہو سکتی۔ تسلیم یکساں نہ ہو تو سلوک یکساں نہ ہو گا اور سلوک یکساں نہ ہو تو سب کا راضی ہونا ناممکن ہے۔ نیک سربراہوں کا پریشان ہونا فطری بات ہے۔ اللہ کے احکام کی اطاعت میں پورا اُترنے کے لیے پوری زندگی بھی کافی نہیں۔

اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اللہ کے حبیب ﷺ کی اطاعت بھی لازمی ہے۔ آپ ﷺ کا ہر عمل سُنّت ہے اور اُس کی پیروی لازم ہے۔ ہم آپ ﷺ کے اقوال و احادیث یاد کر کے اطاعت کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اور آپ ﷺ کا عمل — اگر ہم آپ ﷺ کے اعمال کی اطاعت کریں تو کوئی اِنسان پیوند والے لباس سے زیادہ بہتر لباس زیبِ تن نہ کرے۔ آپ ﷺ سلطان السّلاطین ہیں اور آپ ﷺ کی زندگی معمولی اِنسان سے بھی زیادہ معمولی۔ اللہ اور اللہ کے فرشتے آپ ﷺ پر دُرود بھیجتے ہیں اور آپ ﷺ فاقے سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ نے تمام زندگی کسی اِنسان سے ذاتی اِنتقام نہیں لیا۔

ہم آپ ﷺ کی اطاعت کو جزوِ ایمان سمجھتے ہیں اور ہم آپ ﷺ کی اطاعت کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ ہماری مختصر زندگی میں آپ ﷺ کی سیرتِ طیّبہ کا علم حاصل کرنا بھی آسان نہیں۔ آپ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کا علم حاصل کرنا ہمارا ایمان ہے، لیکن ہمارے لیے آسان نہیں۔ ہمیں اور بھی غم ہیں۔ ہم تسلیم کا بار کیسے اُٹھائیں گے۔

اگر اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کی اطاعت تک بات ہوتی تو خیریت تھی — ہمارے لیے اور بھی فرائضِ تسلیم ہیں۔ قرآن کا علم، قرآن فہمی، قرآن دانی، جبکہ ہم عربی زبان سے

اِتنے آشنا بھی نہیں۔ مختصر زندگی میں قرآنِ کریم کا علم حاصل کرنا سب کے بس کی بات نہیں۔ اپنی زندگی کو منشائے قرآن کے مطابق بسر کرنا فرض ہے، سعادت ہے، لیکن "ایں سعادت بزورِ بازو نیست"

ہماری زندگی — اگر اِسے ساٹھ سال ہی مان لیا جائے تو اِس زندگی میں بیس سال سے زیادہ نیند کا عالم ہے۔ اِس زندگی میں سے کچھ سال بِک جاتے ہیں۔ ہم زندگی بیچ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ زندگی کا پریشر، بس پریشر کُکر ہی ہے۔ اِنسان پِستا جا رہا ہے۔ ہم لوگ پُوری محنت کرنے کے بعد بھی زندگی کی ضروریات پُوری کر سکنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ضرورت کے پاؤں حاصل کی چادر سے باہر ہی رہتے ہیں۔

ہم لوگ ملازمتوں سے ریٹائر ہو کر اُنہی مصیبتوں میں مبتلا ہوتے ہیں جن کے علاج کے لیے ملازمت کی تھی، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد پھر کسی ملازمت کی تلاش ہوتی ہے۔ پھر کسی کرائے کے مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ حالات کا حکم نافذ رہتا ہے اور ہم اطاعت میں مصروف ہوتے ہیں۔ کس کس کا حکم مانا جائے، ضرورت کا حکم، بیماریوں کا حکم، سماج کا حکم اور پھر مذہب کا حکم، اُس پر مُستزاد حکومت کے اَحکام!

بات یہاں تک ختم ہو جاتی تو گزر ممکن ہونے کی صورت رہ جاتی — ہم پر اور بھی اطاعتیں واجب الادا ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے اِرشادات ہمارے لیے مینارۂ نُور ہیں۔ ہم جان پر کھیل کر بھی اُن کی اطاعت کریں گے۔ آئمہ کرام کی اطاعت، فقہا کی اطاعت، اور پھر اولیائے کرام و علمائے حق کے ارشادات ہمارے لیے جادۂ حق کے رَوشن سنگِ میل ہیں۔ ہم اطاعت پر مجبور ہیں اور اِس مجبوری پر مسرور ہیں۔ اِتنی مجبوریوں میں اور بھی آوازیں شامل ہو جاتی ہیں۔ اِقبالؒ کے اِرشادات، کبھی اپنے من میں ڈوب جانے کا حکم، کبھی زمان و مکاں توڑ کر نکل جانے کا حکم! اقبالؒ کی اطاعت ہم فرزندِ اقبالؒ سے زیادہ تو نہیں کر سکتے۔ الحمدُللہ! بچت کی راہ ابھی باقی

ہے، ورنہ اقبالؒ آشنائی کے فرض سے کوتاہی کے اِحساس سے شرمندگی میں ڈوب کر مر جانے کا مقام پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ ہمیں اقبالؒ سے محبت ہے، ضرور ہے، لیکن اِتنی محبّت تو ممکن ہی نہیں جتنی اولاد کو باپ سے ہو سکتی ہے۔ ہم عظیم اِنسان کے نام لیوا ہیں۔ اُس کے وارث تو نہیں۔ تسلیم کا بوجھ اتنا اُٹھائیں گے، جتنا ہمارے حِصّہ میں آیا!

ہم پر قائداعظمؒ کے اِرشادات کی تسلیم کا حق ادا کرنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے۔ قائداعظمؒ کا ہر قول ہمارے لیے قولِ سدید ہے۔ قائداعظمؒ کی زندگی بھی ہمارے لیے ایک عملی نمونہ ہے۔ اُس کا اِسلامی تشخص بھی ہمارے لیے نمونہ ہے۔ جتنا اِسلامی عمل قائداعظمؒ اور اقبالؒ کے پاس تھا، بس اتنا ہی اِسلامی عمل ہمیں منظور ہے، لیکن ہمارے عُلماء اتنے عمل سے راضی نہیں ہوتے۔

سوال یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ایک زندگی میں ہم کس کس کی زندگی کو نمونہ مانیں اور ایک دماغ سے کس کس کی بات کو قولِ فیصل مانیں، اور ایک دِل سے کس کس سے محبّت کریں۔ ہمارے لیے تسلیم کا بار، بارِ گراں ہے۔

اگر ہم اللہ کے محبوب ﷺ کی اطاعت ہی اپنے لیے فرض سمجھ لیں تو کسی اور کا کچھ بھی فرمایا ہوا ہمارے لیے قابلِ تقلید کیوں ہو — ہوا کرے کوئی، جو بھی ہو، اِبنِ مریمؑ ہی سہی۔ ہم ٹھہرے غلامانِ رسول ﷺ۔ ہم پر کوئی اور اطاعت مسلّط ہو، تو کیوں ہو؟ ہمارا یہ سوال ہے مفکرینِ اِسلام کی خدمت میں —!!

معمولی بات

معمولی باتیں بڑے غیر معمولی نتائج بر آمد کرتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک چھوٹی سی بات اِتنی بڑی بات ہوتی ہے کہ اُسے دانائی اور رعنائیِ خیال کی اِنتہا سمجھ لیا جاتا ہے۔ اگر چھوٹی بات کو چھوٹا نہ سمجھا جائے تو کوئی بڑی بات بڑی نہ رہ جائے۔

چھوٹے کاموں کو بڑی احتیاط سے کرنے والا اِنسان کسی بڑے کام سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا۔ چھوٹے اِنسانوں سے محبّت کرنے والا، اُن کا ادب کرنے والا، اُن سے برابر کا سلوک کرنے والا، کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ سے نہیں ڈرتا۔ "معمولی انسان" سے محبّت غیر معمولی اِنسان کا ڈر نکال دیتی ہے۔ ایک سجدہ حاصل ہو جائے، تو ہزار سجدوں سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

دُنیا کے عظیم اور غیر معمولی واقعات کی بنیاد میں اکثر اوقات معمولی اِتفاقات نظر آئیں گے۔ ایک اِنسان نے دُوسرے کو دیکھا۔ معمولی سی بات تھی۔ ایسے اکثر ہوتا رہتا تھا، مگر اِس دفعہ ایک اِنسان کو دُوسرے کے چہرے میں کچھ اور ہی نظر آیا۔ معمولی سی بات ہے، نظر کا ملنا اور پھر دل کا دھڑکنا، اور پھر کائنات کا رنگ و نُور میں ڈھل جانا۔ غرضیکہ بے شمار غیر معمولی واقعات پیدا ہو جاتے ہیں، فوجیں لڑ جاتی ہیں، تخت چھن جاتے ہیں، ملک آباد یا برباد ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں کتنی ہی آنکھوں کو خون کے آنسو دے جاتی ہیں۔ قلوپطرہ کی ناک قدیم مصری اور یونانی تہذیب میں بڑے غیر معمولی نتیجے بر آمد کرتی رہی ہے۔

معمولی سے پرندے ہُدہُد کی اطلاع سے ایک غیر معمولی، عظیم پیغمبر حضرت سلیمانؑ

کے دربار میں کتنے ہی غیر معمولی واقعات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِرادہ ہی عمل بن جاتا ہے۔ خواہش اور حاصل میں فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ علم والے ایسے علم کا اظہار کرتے ہیں کہ دُور کا نظارہ اُڑتا ہوا پاس آجاتا ہے۔ ہُدہُد نے ہلچل مچادی۔ معمولی نے غیر معمولی کی راہ دکھادی۔

ایک معمولی اِنسان جس کا نام "دِھیدو" تھا، ایک بستی میں ایک لڑکی سے ملا — گاؤں اور شہروں کی زندگی میں ایسے ہوتا ہی رہتا ہے۔ معمولی سی بات ہے، لیکن اِس معمولی واقعے کو ایک غیر معمولی شاعر مل گیا — وارث شاہؒ نے معمولی کو کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ وارث شاہؒ کے اپنے عرفان نے ہیر رانجھے کے قصّے کو راہِ سلوک بنادیا۔ ہیر کو پَر لگ گئے، رانجھے کو رفعتِ خیال کے گھوڑے پر سوار کرادیا گیا۔ شاعر نے حُسنِ بیان کی وہ گُل کاریاں کی ہیں کہ بس یہ اُسی کا حصّہ ہے۔ جس طرح لوگ مثنوی کو "قرآں دَر زبانِ پہلوی" کہتے ہیں، اُسی طرح عشّاقِ وارث شاہؒ اِس کتاب کو قرآن کی طرح حفظ کرتے ہیں۔ اِس کی بڑے اہتمام سے "تلاوت" کرتے ہیں۔ صحیح یا غلط، اِس سے بحث نہیں۔ بات یہ ہے کہ معمولی سے کتنا غیر معمولی نتیجہ نکلا۔ آج ہمارے سکالر ہیر رانجھا پر مقالے لکھتے ہیں، ڈاکٹریٹ کرتے ہیں — نہ ہیر ڈاکٹر، نہ رانجھا پروفیسر، نہ وارث شاہؒ صدرِ شعبہ — بس اُن پر مقالہ نگار ڈاکٹر۔ کتنے بڑے امکانات پیدا کیے ایک چھوٹے سے واقعہ نے کہ "دِھیدو رانجھا" گھر سے بھاگ گیا۔ بس وہ گھر سے نکل کے اَدب کے گھر میں جا پہنچا۔ عرفان کے گھر میں داخل ہو گیا۔ نصیب کی منزلوں کا سفیر ہوا۔ آج وہ ایک بہت بڑی روحانی علامت ہے۔

کیا فطرت اپنے غیر معمولی واقعات کو معمولی تعارف سے شروع کرتی ہے؟ غالباً ایسے ہی ہے۔ ایک بچّے نے خواب دیکھا۔ باپ نے کہا: "بیٹا! اپنا خواب بھائیوں کو نہ سنانا"۔ بھائی سُن گئے۔ بس پھر واقعات شروع ہو گئے۔ قرآنِ کریم میں اِس واقعے کو بہت ہی اَحسن کہا گیا۔ معمولی سی بات تھی — خواب، غیر معمولی نتیجہ — مصر کی بادشاہی، پیغمبری اور قرآن میں تذکرہ، اور دُنیا میں ایک عظیم مثال — حُسنِ یوسفؑ اور پھر علامت، برادرانِ یوسفؑ — اِتنے اپنے اور

اِتنے بیگانے!

بہر حال یہ دنیا اکثر عظیم واقعات کے پسِ پردہ ایک معمولی سا راز رکھتی ہے۔ وہ راز اَمرِ الٰہی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو، دیکھنے میں معمولی اور سمجھنے میں بڑا غیر معمولی!

تاریخِ ہند میں ایک کبوتر کے بعد دوسرے کبوتر کا اُڑنا حُسنِ معصوم کی اَدائے دلفریب کے طور پر آج بھی تاریخ کے طالب علموں کے لیے لُطف کا باعث ہے۔ کچھ لوگ کبوتر کے اُڑنے کو علامت کے طور پر ہی لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، چلو ایک کبوتر تو اُڑا، سو اُڑا۔ خدا کے لیے دوسرا کبوتر ہاتھ سے نہ چھوڑ دینا، ورنہ تاریخ ختم ہو جائے گی۔

دُنیا میں ہونے والے ایسے معمولی واقعات جن کا نتیجہ بہت ہی غیر معمولی تھا، بے شمار ہیں۔ سب سے اہم معمولی واقعہ بس مکڑی کا کمزور جالا تھا، کتنا معمولی سا واقعہ! کھوجی کہتا ہی رہ گیا کہ اِسی غار میں ہیں وہ، جن کی تلاش ہے — مگر کیسے! مکڑی کا کمزور جالا ایک قوی دلیل بن کر آڑے آیا اور پھر معمولی سے واقعہ نے غیر معمولی انسان کی غیر معمولی حفاظت کا سامان پیدا کر دیا۔

یہی نہیں، ایک بار پھر — آپ ﷺ کے خلاف سازش موجود ہے اور آپ ﷺ سے درخواست بھی کی گئی کہ آپ ﷺ سازشی کے گھر تشریف لائیں لیکن آپ ﷺ نے اِتنا اہم فیصلہ اُونٹنی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ تو معمولی باتوں کے راز جاننے والے تھے۔ اُونٹنی کا فیصلہ تو وہی ہونا تھا جو اللہ کا اَمر تھا۔

غیر معمولی لوگ معمولی باتوں سے ہی راز آشنا ہوتے ہیں۔ ایک آدمی نے جنازہ دیکھا۔ پوچھا: ”یہ کیا ہے؟“ اُس کے درباریوں نے کہا: ”جہاں پناہ! یہ جنازہ ہے، مرنے والے کا آخری سفر اور یہ ہر آدمی کے ساتھ ہوتا ہے“۔ گوتم بدھ نے کہا: ”ارے! یہ ہر آدمی کے ساتھ ہوتا ہے تو تم لوگ اتنے بے حِس کیوں ہو۔ آخری بات سے پہلے کوئی اور بات ضرور ہو گی۔ اُسے دریافت کرنا چاہیے“۔ وہ تخت چھوڑ کر جنگل کو نکل گیا۔ راز آشنا ہو گیا۔ اُس نے معمولی واقعہ سے

غیر معمولی بات حاصل کر لی۔

ہمارے ہاں بھی بڑی معمولی باتیں ہو رہی ہیں۔ بس اِن کا غیر معمولی نتیجہ سمجھنے والا ہی کوئی نہیں۔ اِسلام کے نفاذ میں معمولی سی تاخیر، جمہوریت کے معمولی سے قافلے، معمولی سی بد اعتمادیاں اور معمولی سی غفلتیں، افغانستان کے معمولی سے جہازوں کا معمول، قوم کے اندر معمولی سا انتشار — اور ایک معمولی سا تغافل — کہیں کسی غیر معمولی واقعے کی نشاندہی نہ ہو۔ دوسرا کبوتر اُڑانے کی تاریخ نہ دہرائی جائے۔ معمولی باتوں کو معمولی نہ سمجھا جائے!!

گمانوں کا لشکر، یقیں کا ثبات

اللہ نے یتیم کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ہے۔ ہم یہ نہیں پوچھ سکتے کہ اللہ نے اُسے یتیم ہی کیوں کیا ہے۔ اللہ اُسے خود ہی کیوں نہیں کھانا عطا کرتا۔ شکوک و شبہات کی دنیا میں سوال اُبھرتے ہیں۔ یہ کیوں، ایسا کیوں نہیں، ایسے ہونا چاہیے تھا۔

شک ایمان کی نفی ہے۔ وسوسہ یقین کا گُھن ہے۔ اگر عاقبت اور خدا پر یقین نہ ہو تو خیال پراگندہ ہو جاتا ہے۔ پراگندہ خیال سماج میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ جب تک انسان کو اپنے عقیدے پر مکمل اعتماد اور اعتقاد نہ ہو، وہ حقیقت کو کیسے تسلیم کر سکتا ہے!

یقین سے محروم انسان صرف سوال ہی کرتا رہتا ہے کہ اللہ نے یہ کیوں کیا، ایسے کیوں نہیں۔ صاحبِ یقین یتیم کو کھانا کھلاتا ہے اور اسے اپنے لیے سعادت سمجھتا ہے۔ عقیدے کو ثابت نہیں کیا جا سکتا، اسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کا ثبوت اپنی ہی پیشانی میں ذوقِ سجدہ کی شکل میں ملتا ہے۔ اگر ذوقِ جبیں سائی نہ ہو تو عقیدوں کے محل مسمار ہو جاتے ہیں۔ مابعد پر صرف اعتماد ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کی حقیقت کو ثابت کرنا مشکل ہے۔

آج کے انسان اور مسلمان کے لیے یہ مرحلہ مشکل ہے کہ وہ اپنے عقیدے کو محفوظ رکھے۔ عقیدہ قدم قدم پر ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اللہ ہی رزق دینے والا ہے۔ ہم سوچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ رزق کی تقسیم نامنصفانہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ نے کچھ اِنسانوں کو صرف غریب رہنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ اللہ جس نے سب کے لیے یکساں زندگی پیدا کی — سورج کی روشنی سب کے لیے ہے، سب انسانوں کو ایک ہی

صورت عطا ہوئی، پیدائش ایک جیسی اور موت بھی سب کے لیے یکساں — اُس کے خزانے سب کے لیے ہیں لیکن معاشی ناہمواری کا سبب کیا ہے؟ کون ہے جو حق سے زیادہ حاصل کرتا ہے اور کون ہے جو حق سے محروم رہتا ہے۔

ستم کی بات تو یہ ہے کہ اَمیر آدمی اپنی دولت کو اللہ کا فضل بیان کرتا ہے۔ اَمیر اِنسان ناجائز ذرائع سے دولت کماتا رہتا ہے اور ساتھ ہی اعلان کرتا رہتا ہے کہ اُس کی عبادت منظور ہو گئی، اللہ نے رحم فرما دیا، وہ بڑا مہربان ہے۔ یتیم کا مال کھانے والا حج کرتا ہے اور خدا کے گھر میں داخل ہوتا ہے، بڑے یقین کے ساتھ۔ اللہ کا حکم نہ ماننا اور اُس کے رُوبرو ہونا، اُس کے دُوبدو ہونے کے برابر ہے۔ اَمیر آدمی کا غلط یقین غریب انسان میں وسوسہ پیدا کرتا ہے۔ غریب سے عبادت کی دولت بھی چھن جاتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اللہ تو بس اَمیر آدمی کا اللہ ہے، اَمیر کی نافرمانیوں کو سزا دینے کی بجائے اُسے انعام دیتا ہے۔ غریب کو صرف غریبی برداشت کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔ یہاں سے عقیدے میں دراڑ پڑتی ہے۔ اَمیر کی دولت اور دولت کی نمائش غریب کو اللہ کی رحمت سے مایوس کر دیتی ہے، لیکن عقیدہ پختہ ہو تو انسان ہر حال سے گزر جاتا ہے، وہ مایوس نہیں ہوتا۔

گمانوں کی تاریک راتوں میں یقین کے چراغ جلتے ہی رہتے ہیں۔ دولت مند انسان میں اگر خوفِ خدا نہ ہو تو اُس کی عاقبت فرعون جیسی ہوتی ہے۔ غریب کا یقین محفوظ رہے تو اُس کے لیے رحمتیں ہیں۔ رزق صرف پیسہ ہی نہیں ہے، ایمان بھی رزق ہے۔ مال فنا ہو جاتا ہے لیکن ایمان قائم رہتا ہے، ہمیشہ کے لیے!!

اللہ کو ماننے والے ہر حال میں راضی رہتے ہیں۔ وہ صحت اور بیماری دونوں میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ صاحبِ یقین ہر حال میں صاحبِ یقین ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اِس دُنیا میں اللہ کریم نے ہر رنگ کے جلوے پیدا فرمائے ہیں۔ اَمیر کے لیے الگ بیماریاں ہیں۔ اُس کے الگ اندیشے ہیں۔ اُس کی عاقبت الگ مخدوش ہے۔ غریب اِنسان کے لیے غریبی باعثِ ندامت نہیں۔

اَمیر غریب کی بحث نہیں، ہر انسان بیک وقت اَمیر بھی ہے اور غریب بھی۔ جو اپنے نصیب پر خوش ہو، وہی خوش نصیب ہے۔ جس انسان کی آرزو حاصل سے زیادہ ہو، وہ غریب ہی ہے۔ دیکھنے والی بات صرف اتنی ہے کہ کون اپنے حال پر مطمئن ہے۔ کون ہے جو اپنی حالت پر راضی ہے۔ کون ہے جو اپنے ماحول میں صاحبِ یقین ہے۔ کون ہے جو گمانوں کے لشکر میں گھرا ہے۔ کس کا دِل اُس کی یاد سے آباد ہے۔ کون ہے جو عارضی زندگی پر مغرور ہے۔ کیا صرف دولت ہی نے اِنسان کو اپنے رب کے سامنے مغرور کر رکھا ہے۔ امیر غریب ختم نہیں ہو سکتے۔ عقیدے کے قیام کے ساتھ بھی یہ طبقے قائم رہتے ہیں۔ زکوٰۃ دینے والا تب ہی ہے، جب لینے والا ہو۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کون ہے جو اَمیر ہو کر خوفِ خدا رکھتا ہے اور کون ہے جو غریبی میں یقین کی دولت سے مالا مال ہے۔ تخلیق میں رنگینی اور حُسن اِسی وجہ سے ہے کہ کوئی کسی کے برابر نہیں۔ کوئی کسی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ کوّا، کوّا رہے گا اور مور، مور۔ اچھا اَمیر بھی بہت اچھا ہے، بُرا غریب بھی بہت بُرا۔ اللہ کے ہاں تقویٰ کی عزت ہے۔

یہ کتنے غور کی بات ہے کہ جس اِنسان پر اللہ دُرود بھیجتا ہے، اُس کو یتیمی اور غریبی سے گزرنا پڑا۔ عجب بات ہے کہ نبیوں کے نبی ﷺ ہیں، پیغمبروں کے پیغمبر ﷺ ہیں، دُنیا کے ہر اِنسان سے زیادہ معزز ہیں اور وادیٔ طائف سے زخمی ہو کر نکلتے ہیں، اور اللہ آپ ﷺ کے ساتھ ہے۔ بات تقرّب کی ہے، تعلق کی ہے، ثروت و دولت کی نہیں۔ اگر گھر میں چراغاں ہو اور دل میں تاریکی تو کیا حاصل۔ اگر غریبی میں سرمایۂ یقین مل جائے تو ایسی غریبی پر ہزار خزانے قربان۔

آج کا دَور سائنس اور فلسفے کی وجہ سے بے یقینی کا شکار ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ کثرتِ مال کے اندر تنگیِ حال موجود ہے۔ اِنسان کو غافل کر دیا ہے کثرتِ مال نے، حتیٰ کہ وہ قبر میں جا گرتا ہے اور پھر اُن مسرتوں پر افسوس ہوتا ہے جو غریب کو اُس کے حق سے محروم کر کے حاصل کی گئیں۔

آج کا ذہن شبہات کی آماجگاہ ہے۔ شکوک پرورش پا رہے ہیں، گمان پَل رہے ہیں۔ دِل سوز سے خالی ہو گیا ہے۔ اِنسان خدا سے دُور ہوتا جا رہا ہے کیونکہ وہ دولت کے دیوتا کا پجاری ہے۔ کوئی انسان دو آقاؤں کا غلام نہیں ہو سکتا۔ آج کا انسان کئی آقاؤں کا غلام ہے—دولت کا غلام، اسلحے کا غلام، جمہوریت کا غلام، ہر خواہش کا غلام۔ انسان اپنی آرزو کے آگے سجدہ کرتا ہے، خدا کے آگے نہیں جھکتا۔ وہ ایک سجدہ جو ہزار سجدوں سے نجات دلاتا ہے، آج کے انسان کو حاصل نہیں ہوا۔

لاکھوں مساجد میں صبح شام، دن رات، لاؤڈ سپیکروں پر اسلام پھیلایا جا رہا ہے اور تاثیر کا یہ عالم ہے کہ معاشرہ پراگندہ ہے۔ کیا نہیں ہو رہا؟ کیا نہیں ہو چکا؟ مبلّغ یقین سے محروم ہو تو تبلیغ تاثیر سے محروم ہو جاتی ہے۔ آج بے یقینی ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ جس انسان کو اپنے آپ پر یقین نہ ہو، وہ خدا پر کیا یقین رکھے گا!

ہم محروم ہو گئے، اُن حقیقی مسرّتوں سے جو یقین اور صرف یقین سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو شخص روزہ نہ رکھے، وہ عید کی مسرّت کیسے حاصل کرے۔ عید کی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی، یقین سے ہوتی ہے۔ روزے کے انکاری جب عید مناتے ہیں تو اُن کے چہرے بے نُور ہوتے ہیں، اُن کے دل بے حضور ہوتے ہیں۔ روزے دار کا چہرہ تابدار ہوتا ہے، اُس کا دل حقیقی مسرّتوں سے ہمکنار ہوتا ہے، اُس کا سینہ یقین سے پُر نور ہوتا ہے، اُس کی آنکھ میں سُرور ہوتا ہے، اُس کے لیے عید کی نماز سجدۂ نیاز ہے، بے نیاز کے حضور—!

دنیا کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو اِس میں یقین اور شکوک کے معرکے نظر آتے ہیں۔ صاحبِ یقین آگ میں چھلانگ لگا دیتا ہے اور صاحبِ گمان دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ آگ گلزار کیسے ہو گئی۔ یقین کے جلوے ایمان والوں کا اثاثہ ہیں۔

صاحبِ یقین خوف و حُزن سے آزاد ہے۔ اُسے نہ آنے والے کا ڈر ہے، نہ جانے والے کا ملال۔ وہ صرف اپنے مالک کے عمل کو دیکھتا ہے۔ دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ شکر

کرتا ہے کہ اسے شکر کرنے والا بنایا گیا۔

صاحبِ یقین خرد کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے اور گیسوئے ہستی بھی سنوارتا ہے۔ صاحبِ گمان اپنے وسوسوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ اسے نہ یہ زندگی راس آتی ہے نہ وہ زندگی، جس کے بارے میں اسے شک ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹتا رہتا ہے اور پھر شکستہ جہاز کو کوئی ہَوا بھی راس نہیں آتی۔

یقین کی طاقت پتھروں سے نہر نکالتی ہے۔ موت سے زندگی نکالتی ہے۔ یقین کچّے گھڑے کو پکا رنگ دیتا ہے اور گمان محلّات میں رہ کر لرزتا ہے، خوفزدہ ہوتا ہے، سراسیمہ رہتا ہے۔

یقین کے ساتھ اللہ ہے اور گمان کے ہمراہ شیطان۔ آج کی دنیا میں صاحبِ کرامت ہے وہ انسان جو صاحبِ یقین ہو۔ آج کے دَور کی آگ سرمایہ پرستی کی آگ ہے، ہوس پرستی کی آگ ہے، خود پرستی کی آگ ہے۔ آج کا ابراہیم وہ انسان ہے جو اِس آگ میں گلزار پیدا کرتا ہے، جس کی نگاہ خیرہ نہیں ہوتی، جس کی آنکھ میں یقین کے جلوے ہیں، جس کے دل میں اعتماد ہے اُس ذات پر جو اُس کی مسجود ہے، اُس کی محبوب ہے، جو ہمہ حال موجود ہے۔

ہم من حیث القوم بھی یقین سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم میں بلند فکری کا فقدان ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ ہم آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہیں، اُلجھتے ہیں۔ صوبوں کی بحث ہے، زبان کی بحث ہے۔ اقتدار کی ہوس نے ہمیں یقین سے محروم کر دیا۔ ہم کوشش ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ نصیب پر اعتماد نہیں۔ گدھا ہزار کوشش کرے، گھوڑے کا نصیب نہیں حاصل کر سکتا۔ ہم دوائی کو صحت سمجھتے ہیں اور صحت کو زندگی کا دَوام۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اِس فنا کے دیس میں کسی چیز کو قیام نہیں —— نہ صحت ہمیشہ رہ سکتی ہے، نہ زندگی۔ ہمیں یقین کیوں نہیں آتا۔ ایک عارضی مقررشدہ قیام کے بعد نہ فرعون رہ سکتا ہے، نہ موسیٰؑ —— نہ کمزور ٹھہر سکتا ہے، نہ توانا۔ ہم اُس زندگی کے لیے جوابدہ ہیں جو ہمیں ملی۔ ہم دوسروں کے جوابدہ نہیں ہیں۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔ کسی سے وہ سوال نہیں ہو گا جو اُس سے متعلق نہ ہو۔ ہمیں اپنی پیشانی اور اپنے مسجود سے غرض ہے، اپنے ایمان اور اپنے یقین سے کام ہے۔

ہمیں اپنے وسوسوں سے نجات چاہیے۔ ہمیں اپنے دل سے اپنے عقیدے پر اعتقاد کرنا ہے۔ خدا سے دولتِ یقین کا سوال کرنا ہے۔ الٰہی! ہمیں پھر سے وہی یقین دے۔ ہمیں پھر سے اپنا بنا۔ ہمیں پھر وہی جلوے دکھا۔ ہمارے دلوں کو پھر سے نورِ ایمان عطا کر۔ ہمیں ہمارے گمانوں سے بچا۔ ہم شبہات کی دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ ہم شکوک کے تاریک راستوں پر آ نکلے ہیں۔ الٰہی! ہمیں عطا کر، پھر سے کوئی صاحبِ یقین راہنما۔ ہم اپنی آرزوؤں کی کثرت کا شکار ہو گئے ہیں۔ یقین کی وحدت عطا فرما۔

یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا۔ اُس کے پاؤں ڈگمگاتے نہیں۔ اُس کے اعتقاد میں لغزش نہیں آتی۔ اُسے کوئی دبدبہ ڈرا نہیں سکتا، اُسے کوئی پیشکش لُبھا نہیں سکتی۔

گمانوں کے لشکر میں یقین کا ثبات ایسے ہے جیسے یزیدی فوج کے سامنے اِمام حسینؑ کا ایمان — تاریکی کے حصار میں روشنی کا گلاب — یقینِ بے گماں کا کرشمہ — دولتِ لازوال کا معراجِ کمال —!!

۩۩۩

مذہب

سورج سے کسی نے اُس کا مذہب پوچھا۔ وہ خاموش رہا، مسکراتا رہا۔ سوال دہرایا گیا تو سورج نے کہا: ”آنکھ ملا کے سوال کرو“۔ اُس نے کہا: ”تم سے آنکھ تو نہیں ملا سکتے، تم اتنے تابناک ہو“۔ سورج نے کہا: ”تم خود سوچو، میرا مذہب کیا ہے“۔ سائل سمجھ گیا کہ سورج کا مذہب اِسلام ہے۔ اِس کا تذکرہ قرآن میں ہے۔ پھر اُسے معاً خیال آیا کہ قرآن میں تو کفّار کا بھی ذکر ہے، شیطان کا بھی ذکر ہے۔ وہ بڑا پریشان ہوا۔ اِس سوچ میں گم ہو گیا کہ آخر سورج کا مذہب کیا ہے۔ وہ سوچ کے سمندر میں غوطہ زَن تھا کہ اُسے آواز آئی: ”نادان! سورج کا مذہب صرف روشنی ہے، نُور ہے“۔ یہ مذہب اُسے فطرت نے، بلکہ فاطِر نے عطا کیا ہے۔ سورج، چاند، ستارے اپنے اپنے مذہب پر کاربند ہیں۔ یہ اُن کا مدار ہے۔ اُن کے لیے مدام گردشوں کا مذہب مقرر ہو گیا ہے اور وہ کفر و اسلام کے تفرقوں سے آزاد ہیں۔ سب کے لیے یکساں ہیں، رنگ و نسل سے آزاد، عذاب و ثواب سے بے نیاز!

اُس نے سوچا کہ یہ عجیب بات ہے کہ مذہب سب کا الگ ہے اور خالق سب کا ایک ہے، تعجب ہے! ایسے نہیں ہو سکتا۔ اُس نے سوچا اور وہ سوچتا ہی چلا گیا۔ اللہ تو قادرِ مُطلق ہے، خلاّقِ عظیم ہے۔ اللہ نے اِبلیس کو پہلے دن ہی ”ٹھاہ“ کیوں نہ کر دیا—نہ ابلیس ہوتا، نہ یہ بکھیڑے ہوتے۔ یہ رنگ رنگ کے نیرنگ، یہ فرق فرق کے فرقے، یہ عہد عہد کے معبد، یہ الگ الگ سجدے، یہ روپ روپ کے بہروپ، یہ ایک آدم اور کئی انسان، یہ ایک خدا اور اُس کی جدا جدا عطا—یہ عجیب صورتِ حال ہے—مذہب اور پھر مذاہب۔ اگر سب مذاہب سچ ہیں تو

مذہب کیا ہے، اور اگر سب مذاہب سچ نہیں تو مذہب کیا ہے؟

مذہب کے نام پر دنیا میں کیا کیا نہیں ہو چکا۔ مذہب کی آڑ میں کیا کیا نہیں کیا جا چکا۔ مذہب کی حفاظت میں کیا کیا نہیں قربان ہوا، اور پھر مذہب انسان کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔

لامذہب بھی اپنے لیے ایک مذہب رکھتا ہے۔ وہ اپنی "لامذہبیت" پر ایسے کاربند ہے جیسے مذہب والا اپنی "مذہبیت" پر!

کافر خود کو اپنے کفر کا مومن سمجھتا ہے اور مومن کبھی کبھی اپنی کئی کافرانہ حرکات و عادات کو ایمان ہی کا حِصّہ سمجھتا ہے۔ وہ صرف لباس مذہبی اختیار کرتا ہے اور اعمال — چلو اعمال کا ذکر چھوڑو، کوئی اور بات کرو! اعمال کا ذکر کیسے چھوڑیں؟ کوئی اور بات کیسے کریں؟ مذہب گناہ کی سزا دیتا ہے، گنہگار کو اپنے دامن سے دُور نہیں کرتا۔ یہی تو عجب بات ہے کہ مذہب بھی جاری رہے اور بُرائی بھی قائم رہے۔ بُرا اِنسان اچھا مذہب اختیار کر لینے کے باوجود بُرا، اور تعجب ہے کہ اچھا اِنسان مذہب اختیار نہ کرنے کی وجہ سے پھر بُرا۔ یہی مذہب کی آمریّت ہے کہ وہ ایک غیر مُبدّل نظامِ تعزیر رکھتا ہے۔ جو مذہب کو نہ مانے، اُس کے لیے ایک جہنم، نارِ جہنم، عذاب، عبرت مقرر ہے، اور جو مذہب کو مانے اُس کے لیے ایک ایسا راستہ ہے جس پر چلنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ مدد نہ فرمائے اور اللہ کی مدد مقدّر والوں کے حصّے میں آتی ہے۔ آج کا انسان مذہب سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ کیوں؟ مذہب نے اُس کا کیا بگاڑا ہے؟ مذہب کی موجودگی میں وہ اپنے گناہوں پر ندامت کرنے پر مجبور ہے۔

وہ حرام مال کماتا ہے اور اِس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ حلال کی کمائی ممکن نہیں ہے، اور اگر ہے تو بہت کم، بلکہ کم کم، اور جب وہ حرام مال گھر میں لاتا ہے تو اُسے یاد آتا ہے کہ ایک وقت آنے والا ہے کہ اِنسان سے اُس کے مال اور اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ وہ مذہبی خیال سے دُور بھاگتا ہے اور مذہب اُس کے اپنے اندر سے آواز دیتا ہے: "خبردار! تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ مَیں تمہارے ضمیر میں ہوں، تمہارے خون میں ہوں، تمہارے خمیر میں ہوں۔

غافل! بھاگنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ٹھہر جا اور غور کر۔ یتیم کا مال واپس کر دے۔ دیکھ! اپنے بچوں کو آگ نہ کِھلا۔ یہ ناجائز کمائی تیری اولاد کے لیے آگ ہے۔ تیرے معصوم بچوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ اِن معصوموں پر رحم کھا۔ اِنہیں عذاب کا لقمہ نہ کھلا۔ رشوت کی دولت تیرے لیے، تیری اولاد کے لیے ایک عذاب ہے۔ باز آ— نادان! عقل کر!" —لیکن نادان کیسے عقل کرے۔ مذہب کیا بتائے؟

مذہب نے زندگی میں بڑے اِنقلاب بپا کیے ہیں۔ اَمیر آدمی کو مذہب بڑا راس آیا ہے۔ وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کی مہربانیاں حاصل کرتا ہے۔ مال جمع کرتا ہے اور بہت زیادہ جمع کرتا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور صرف شکر ہی ادا کرتا ہے، مال تقسیم نہیں کرتا۔ وہ غریبوں کو توکّل کی دولت سے مالا مال دیکھنا چاہتا ہے۔ غریب کو صبر اور استقامت کا درس دیتا ہے، اُسے مال نہیں دیتا۔ وہ بیمار کے لیے دُعا کرتا ہے، اُسے دوائی نہیں دیتا اور خود بڑے بڑے ہسپتالوں میں داخل خارج ہوتا رہتا ہے۔ اُس کے جسم سے خوشبو آتی ہے۔ اُس کا لباس عطر میں ڈوبا ہے اور دِل فکر میں! اُسے معلوم ہے کہ جسے وہ مذہب سمجھ رہا ہے، وہ مذہب نہیں ہے۔ وہ مذہب کا لبادہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سچا مذہب لبادوں اور نقابوں سے آزاد ہے۔

آج مذہب پر گفتگو ہوتی ہے بلکہ "گفتگوئیں" ہوتی ہیں۔ ٹی وی پر افہام و تفہیم کے ذریعے مفہومِ دین بتایا جاتا ہے اور کسی مبلّغ کی بات کسی اور مبلّغ کی بات سے ملتی نہیں۔ شاید سب سچّے ہیں۔ سب سچّے ہیں؟ سب کیسے سچّے ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگ سچّے ہیں اور کچھ لوگ جھوٹے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایک مذہب میں کچھ لوگ سچّے اور کچھ لوگ جھوٹے —پھر! کیا سارے جھوٹے ہیں؟ نعوذ باللہ! اللہ ہمیں ہمارے نفس کے شر سے بچائے۔ ہم کیوں جھوٹ بولیں۔ آخر ایک دن ہمیں مرنا ہے اور پھر "موت کا منظر —مرنے کے بعد کیا ہو گا؟" اللہ کی رحمتوں اور رحمتوں والے نبی ﷺ کی رحمتوں کو ماننے والے کے لیے مرنے کا منظر اور موت کا منظر رحمت ہی رحمت ہے، لیکن کون مانے۔ مذہب والوں کو یہ بات کیسے سمجھ آئے!

کیا اللہ کی رحمت اُس کے غضب سے وسیع نہیں ہے؟ کیا حضور ﷺ رحمۃ للعالمین نہیں ہیں؟ مرنے کے بعد کا عالم — آپ ﷺ کی رحمت!

اگر رحمت اعمال کے نتیجے سے انسان کو نہ بچائے تو رحمت کا تصور کیا ہے؟ کیا اللہ معاف کرنے پر قادر نہیں ہے؟ کیا مذہب والے اور مذہب سے انکار کرنے والے دوزخ میں کبھی اکٹھے ہوں گے؟ اگر ہوئے تو کافر، مذہب والوں کا مذاق اُڑائیں گے کہ تم ہمیں کس نجات کی دعوت دیتے تھے؟ خیر چلو، اِس بات پر کیا بحث۔ جو ہو گا، ہو جائے گا۔ جو کچھ کر رہے ہو، کرتے جاؤ — بس مذہب کے نام پر ہونا چاہیے۔

ہم ایک یا کسی ایک مذہب کی بات نہیں کر رہے، ہم تو عام طور پر مذہب کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اِنسان کا باطن صادق نہ ہو تو صداقت کا مذہب اُسے کوئی فلاح نہیں دیتا۔

اگر کسی کو زندگی کی آسانیوں میں شریک نہیں کرتے تو صرف علم میں شریک کرنے کا فائدہ؟ وہ علم تو بتاؤ جس کے ذریعے تم اِتنے اَمیر ہو اور تمہارا پڑوسی غریب ہے، جبکہ تم دونوں ایک ہی دفتر میں ملازم ہو، ایک ہی تنخواہ پر!!

مذہب پر بحث نہیں ہونی چاہیے۔ چلو اِسی بات پر اتفاق کر لو کہ آئندہ مذہب پر بحث اور مذاکرے نہ ہوں۔ مذہب بتانے والی بات نہیں، کرنے والا کام ہے۔ بات سچی ہے، اور کام؟ کون جواب دے گا!

جب شروع میں کوئی کافر حضور اکرم ﷺ کے پاس قبولِ اِسلام کے لیے حاضر ہوتا تو آپ ﷺ اُسے کلمہ شریف پڑھاتے اور وہ مسلمان ہو جاتا۔ اگر وہ سوال کرتا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے تو اُسے جواب ملتا کہ جو مسلمان کر رہے ہیں، وہی کرو۔ جہاد کا وقت ہے تو تیاری کرو اور اگر امن کا زمانہ ہے تو رزقِ حلال کماؤ، محنت کرو، عبادت کرو۔ کسی سے یہ نہیں کہا گیا کہ اب تم کتابیں پڑھو، تقریریں کرو۔

آج مذہب پر لائبریریاں بھری ہوئی ہیں اور اِنسان کا دل خالی ہے۔ مذہب علم

نہیں، عمل ہے اور عمل کی انتہا یہ ہے کہ وہ انسانِ کامل ﷺ جو سب میں افضل ہیں، اُن کی زندگی سب سے زیادہ سادہ، سب سے زیادہ غریب — اور یہی ہے سب سے زیادہ بلندی۔ مذہب یہ ہے کہ خود پیاسا ہونے کے باوجود اپنے پیاسے بھائی کو پانی کا واحد پیالہ پیش کر دے اور خود جامِ شہادت نوش کر لے۔

مذہب کے عمل کی بات کیا تھی اور علم کی بات کیا ہے۔ کون سا اِنسان ہے جس کا عمل اُس کے علم کا شاہد ہو؟ اگر علم اور عمل میں فرق ہو تو مذہب — لامذہب۔ اِس لیے بہتر ہے کہ عمل دکھاؤ، علم نہ سناؤ — اور یہی ہے مذہب کی اساس، سورج کی روشنی، اُس کا مذہب!

مفروضے اندازے اور مجبوریاں

کہتے ہیں، اور کہنے والے بڑے بزرگ لوگ ہیں اور بزرگوں کے کہے ہوئے میں دوسرے بزرگوں نے اضافے بھی کیے ہیں— تو میں کہہ رہا تھا کہ کہتے ہیں، اضافے کے ساتھ— کہ ایک بستی میں چار افراد تھے۔ اُس بستی کی کُل کائنات یہی چار افراد ہی تھے۔ یہی تھا سرمایۂ دِین و ایمان۔ اُس بستی کی ساری بساط یہی چار افراد تھے یا یوں کہیے کہ یہی چار تنکے تھے اُس آشیانے کے۔ بہر حال وہ چاروں افراد اپنے اپنے احساس میں اور اپنے اپنے مفروضے میں ماہر تھے۔ اُن کو اپنے فن پر ناز تھا اور اُن کا فن ایک اندازہ تھا، ایک مفروضہ تھا، اُن کی غالباً مجبوری تھی۔

اُن میں ایک آدمی اندھا تھا— بڑا باتونی، بڑا فنکار، بڑا ہوشیار، بڑا نابغۂ رُوزگار۔ اُس کے پاس سب کچھ تھا، گفتگو تھی، جواز تھے، بیانات تھے۔ کیا نہیں تھا اُس کے پاس، لیکن مجبوری صرف یہ تھی کہ وہ اندھا تھا۔ اندھا ہونے کے باوجود اُسے اپنی کور چشمی کا اِحساس تک نہیں تھا، بلکہ اِس کے برعکس اُسے اپنی دُور بینی پر ناز تھا۔ وہ ستاروں کی بات کرتا، ستارہ شناسی کا ذِکر کرتا۔ دُنیا میں ہونے والا ہر واقعہ گویا اُس کے رُوبرو تھا، کیونکہ اُس نے تو صرف جھوٹ ہی بولنا تھا اور جھوٹ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ وہ اپنے تینوں ساتھیوں کو واقعات سناتا اور اُنہیں بتاتا کہ اُس پر ہر چیز آشکار ہے۔

دُوسرا آدمی — دُوسرا آدمی ہمیشہ دُوسرا ہی ہوتا ہے۔ اندھے کے مقابلے میں دُوسرا آدمی بہرا تھا۔ اُسے بہرا ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ شخص بڑے کمالات کا مالک سمجھتا تھا خود کو،

وہ اِس کائنات کے نغمات کو سننے کا دعویٰ رکھتا تھا اور بیچارہ سماعت سے محروم تھا۔ وہ کسی کی کچھ نہیں سنتا تھا— مجبور تھا، بے بس تھا۔ دُور کی آوازیں اور قریب کے نغمے سننا اُس کا دعویٰ تھا۔ وہ افواہوں کا سرچشمہ تھا۔ وہ بات شروع کرتا تو کہتا: ”بھائیو! مَیں نے سنا ہے کہ ایک بڑا واقعہ بلکہ معرکہ ہونے والا ہے“۔ اُس سے کوئی نہ پوچھتا کہ تُو نے کہاں سے سنا ہے۔ اپنے پاس سے باتیں بنانے والے سے کون پوچھ سکتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ بہرحال بہرا اِنسان اخبارِ جہاں سناتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو اپنی سماعت کی کرشمہ کاریاں سنا سنا کر مرعوب کرتا تھا۔ اُس کے تینوں ساتھیوں نے اُسے برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔

تیسرا آدمی چیتھڑوں میں ملبوس تھا لیکن اُس کا خیال بلکہ حُسنِ خیال، بلکہ حُسنِ ظن یہ تھا کہ دُنیا اُس کے لباسِ فاخرہ کی دُشمن ہے۔ اُس سے برہنگی کا لباس بھی چھین لے گی، یہ لالچی اور مطلب پرست دُنیا۔ وہ ہمیشہ اپنی دولت کا ذِکر کرتا۔ اپنے سرمائے کا تذکرہ کرتا۔ اُس کو اندیشہ تھا کہ دُنیا اُسے لُوٹنا چاہتی ہے۔ اُسے لباس سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ وہ بیچارہ مجبور تھا کہ اپنے آپ کو لباسِ فاخرہ میں ملبوس سمجھے۔ وہ رات کو جاگتا رہتا کہ کہیں چور نہ آجائے۔ کسی دُوسری بستی کے لوگ آکر اُس کا سرمایہ نہ لے جائیں۔ بیچارہ بڑی اَذیّت میں تھا۔ اثاثہ نہ رکھنے کے باوجود اثاثے والے لوگوں کے اندیشے لاحق تھے، اُس غریب کو۔ سرمایہ داروں کی بیماری تھی، اُس بیچارے بے سروساماں کو— مجبوری ہی مجبوری تھی، عذاب ہی عذاب تھا۔

چوتھا آدمی— بس چوتھا آدمی اُس بستی کی ہستی کا چوتھا پایہ تھا۔ وہ بیچارہ اپاہج تھا— پاؤں سے محروم، لیکن کمال اعتماد تھا اُس کے پاس کہ وہ اپنے آپ کو تیز رفتار سمجھتا تھا۔ وہ چل نہیں سکتا تھا بغیر سہارے کے، لیکن اُسے اِحساس تھا کہ وہ بہت ہی تیز رفتار ہے، کسی ریس کے گھوڑے کی طرح۔ بیچارہ مجبور— مفروضہ ہی مفروضہ، اندازہ ہی اندازہ!!

کہانی ختم ہو گئی، لیکن کہانی کیسے ختم ہو سکتی ہے۔ کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ حقائق ختم ہو جائیں تو بھی کہانیاں جاری رہتی ہیں۔

ایک دِن وہ چاروں افراد آپس میں مل بیٹھ کر اپنی بستی کے بارے میں غور کر رہے تھے، اُس کی ترقی کے منصوبے بنا رہے تھے کہ اچانک ڈراما شروع ہو گیا، بلکہ ڈراپ سین شروع ہو گیا۔

اندھا بولا: ”صاحبان! میرے عزیز ہم وطنو! بلکہ غم وطنو! مَیں دیکھ رہا ہوں کہ دُشمن ہماری طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ ہم خطرے میں ہیں۔ غنیم آ رہا ہے“۔

بہرا تائید کرتے ہوئے بولا: ”ہاں یہ درُست ہے۔ مَیں دُشمن کے ٹینکوں کی آواز سن رہا ہوں۔ اُس کے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی ہیں“۔

ننگے نے فوراً اعلان کر دیا: ”ہاں ہاں! دشمن کیوں نہیں آئے گا۔ اُسے میرے قیمتی لباس کی آرزو تھی۔ بڑی دیر سے دُشمن موقع کی تلاش میں تھا“۔

لنگڑے نے سوچا اور فیصلے کے انداز میں بولا: ”تو بھائیو! سوچ کیا رہے ہو۔ آؤ بھاگ چلیں“

کہانی یہاں ختم ہو جاتی تو اچھا تھا، لیکن جب سے علامتوں نے کہانیوں کو بامعنی بنایا ہے، کہانیاں ختم نہیں ہوتیں۔

بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اندھا وہ اِنسان ہے جو اپنے عیب نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ”پرفیکٹ“ مانتا اور دُوسروں کو گمراہ سمجھتا ہے۔

بہرا وہ اِنسان ہے جو واہ سنتا ہے، خوشامد سنتا ہے لیکن حق کی بات کے لیے اُس کے کان بند ہیں۔ اُس کے کان، اب کان نہیں ہیں۔

ننگا— ہر دُنیادار، غریب بیچارہ، خواہشات اور حاصل کے فرق میں پریشان رہنے والا، جس کا ہمیشہ یہی خیال ہے کہ لوگ اُس کے حصّے کا مال لُوٹ کر لے جائیں گے۔

اور، آخری آدمی — بس مجبوری دَر مجبوری، حصارِ وقت کو توڑ کر نکلنے کی آرزو، لیکن حصارِ وقت میں پابند رہنے کی مجبوری۔ نکل سکتے ہو تو نکل کر دِکھاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے۔ ہر آدمی اپنے اپنے حصار میں رہن رکھ دیا گیا ہے۔ لوگ غور کیوں نہیں کرتے!

ماضی، حال اور مستقبل

اِنسان عجب مخلوق ہے۔ خیال کو حقیقت بناتا چلا جاتا ہے اور حقیقت کو خیال۔ بات آسان ہے۔ مستقبل خیال ہے، ماضی خیال ہے اور حال حقیقت ہے۔ اِنسان مستقبل کو حال اور حال کو ماضی بنا دیتا ہے۔ خود بخود ہی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ بڑے غور و فکر، بڑی سوچ بچار کے بعد ایک مقصدِ حیات بنایا جاتا ہے اور پھر غور و فکر کے بعد اُس مقصد کی بے مقصدیّت دریافت کر لی جاتی ہے اور یوں زندگی علم و عمل، خیال و حقیقت کے مابین کھیلتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

یہاں تک تو بات صحیح ہے کہ اِنسان پردے سے باہر ہے، اور مستقبل اور ماضی دونوں پردے میں ہیں۔ ایک تخیل کے حجاب میں ہے اور دُوسرا یادوں کے پردے میں۔ یہی پردہ اِنسان کو گوارا نہیں۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اب اور کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ وہ اُس کو بھی دیکھنا چاہتا ہے جسے ایک بار دیکھا جا چکا ہے۔ یہ اِنسان کے بس میں نہیں۔ جو دیکھا گیا، سو دیکھا گیا، اور جو دیکھا جائے گا، سو دیکھا جائے گا۔ جو ہے، سو ہے۔

یہ کہہ دینا آسان ہے لیکن اِسے سمجھنا مشکل ہے۔ جس کا حال بد حال ہے، وہ کسی مستقبل کے خوشحال ہونے کا تصور کیسے کر سکتا ہے؟

مستقبل کی خوبی ہی یہ ہے کہ وہ کسی حال کے حوالے سے نہیں آتا۔ وہ اپنا حوالہ خود ہے۔ وہ جیسے چاہے، آئے۔ عاصیوں کے لیے مغفرت لائے، غریبوں کے لیے دولت لائے، عزت کو ذِلّت میں بدل دے، یقین کو وسوسہ، وسوسوں کو یقین بنا دے۔ یہ اُس کی مرضی ہے۔ مستقبل کی مرضی، بس خدا کی مرضی ہے۔ خدا کی رحمتوں سے مایوس نہ ہونے کا حکم ہے، بار

بار حکم ہے، یعنی اپنے مستقبل سے مایوس ہونے کی اجازت نہیں۔ مستقبل پر بھروسہ رکھو، مستقبل پر اُمید رکھو، مستقبل رحمت کا نام ہے۔ اِنسان کو بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رحمت ہمیشہ ہونے والی ہوتی ہے۔ جب ہو جائے تو اِنسان اُسے اپنا حق کہہ کر اپنی محنت اور اپنی عقل کا پھل سمجھتا ہے۔ کشتی ہچکولے کھا رہی ہو تو اللہ کو پکارا جاتا ہے۔ جب کشتی کنارے لگ جائے تو اپنی قوّتِ بازو کے قصیدے کہے جاتے ہیں۔ بہت کم اِنسان ایسے ہیں، جو اپنے حاصل کو رحمتِ پروردگار کی عطا سمجھتے ہوں۔ بہر حال، حال کے بدحال ہونے کے باوجود مستقبل کے خوشحال ہونے کی اُمّید ترک نہ کرنی چاہیے۔

ماضی کے اعمال کے حوالے سے بھی اُمّید اور مایوسی کا پیدا ہونا لازم ہے۔ جب ماضی کے گناہ یاد آتے ہیں تو ندامت کے بوجھ سے سر جھک جاتا ہے۔ گناہ کے لیے ہی تو مغفرت کا لفظ ہے۔ توبہ گناہ کو ختم کر دیتی ہے۔ توبہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اِنسان اُس راہ سے ہٹ جائے۔ گناہ ترک کرنے کا اِرادہ توبہ کا حصہ ہے۔ گناہ نہ کرنے کا فیصلہ توبہ کی عطا ہے۔ توبہ قبول ہو جائے تو گناہ دوبارہ سرزد نہیں ہوتا، بلکہ یادِ گناہ بھی نہیں رہتی۔ اِس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے۔ ماضی کفر ہو تو حال کلمہ پڑھ کے مومن ہو سکتا ہے۔ حال مومن ہو جائے تو ماضی بھی مومن ——!

ایک اِنسان اگر راستہ بھول جائے، بھٹک جائے، پگڈنڈیوں میں کھو جائے، راہوں کے پیچ و خم میں اُلجھ جائے اور اگر اُسے اچانک منزل کا سراغ مل جائے، وہ منزل تک پہنچ جائے، آسودۂ منزل ہو جائے تو اُس کامیاب اِنسان کا تمام سفر، سفر کی تمام کلفتیں کامیابی کا حِصّہ ہیں۔ کامیاب آدمی کا سارا سفر ہی کامیاب ہے۔ جس کو اللہ معاف کر دے، اُس کے گناہوں کا کیا ذِکر؟ جسے اِسلام کی دولت مل جائے، اُس کے پُرانے کفر کا کیا تذکرہ؟

مستقبل میں جلنے والے چراغ ماضی کے اندھیروں کو بھی دُور کر دیتے ہیں۔ خیال اُمّید اور یقین سے واصل ہو جائے تو ہر ماضی خوشگوار ہے، ہر مستقبل روشن ہے۔ روشنی خیال کی

ہے، واقعات کی نہیں۔

حال کی اصلاح کے لیے خیال کی اصلاح ضروری ہے۔ ہم ماضی اور آئندہ کو صرف حال ہی میں سوچ اور دیکھ سکتے ہیں۔ حال کا آئینہ کبھی عکسِ ماضی دِکھاتا ہے، کبھی پَرتَوِ مستقبل۔ آئینہ کجلا جائے تو ماضی بھی تاریک اور مستقبل بھی بھیانک۔ حال کے آئینے کی آب خیال سے ہے۔ خیال کی اِصلاح ہو جائے تو ساری زندگی کی اِصلاح ہو جاتی ہے۔ حال، ماضی اور مستقبل صرف پہچان کے حوالے ہیں۔ زِندگی ایک اکائی ہے، وحدت ہے، جامعیت ہے۔ اِس کا فیصلہ آخری لمحے میں ہوتا ہے کہ زندگی کیا تھی — نوازش یا آزمائش، اِنعام یا سزا، کامیاب یا ناکام، بامراد یا نامراد، معصیّت یا مغفرت!

ہمارا فردا، ہمارا ماضی صرف ہمارے حال کی کرشمہ سازی ہے۔ جس کا آج خوبصورت ہے، اُس کا ماضی بھی خوب — مستقبل بھی خوب۔ جس کا آج پراگندہ ہو، اُس کا گزشتہ بھی پراگندہ، آئندہ بھی پراگندہ۔ حال کی اِصلاح ہونا ضروری ہے۔

حال کی اِصلاح کیا ہے؟ ماضی پر صدقِ دِل سے استغفار اور مستقبل کا خوشگوار اِنتظار — اُمید و تیقّن کے ساتھ اُس کی رحمت کی وسعتوں کے سامنے، اُس کی لامحدود عطا کے سامنے اپنی خطا، اپنی کم مائیگی اور اپنی بے مائیگی کو سرنگوں کر دینا، اُس کے اِنصاف سے ڈرنا، اُس کے فضل کا آسرا مانگنا، یعنی اپنے اعمال پر بھروسہ کرنے کی بجائے اُس کے فضل پر بھروسہ کرنا۔ تاریک راتوں کو سورج کی تابناکی عطا کرنے والا اِنسان کی زندگی کی تِیرگی اور مایوسی کو اُمّید کی روشنی عطا کرتا ہے۔ زمین و آسمان کے لشکروں کا مالک ہمارے لیے بہت کچھ رکھتا ہے، شرط یہ ہے کہ ہم اُسے تسلیم کریں۔

حال بظاہر ایک لمحہ ہے، ایک نقطہ ہے، لامحدود ماضی اور لامحدود مستقبل کا سنگم — لیکن یہ نقطہ دراصل ایک نکتہ ہے۔ حال پھیل جائے تو صدیوں پر محیط ہو جائے۔ یہ لمحۂ حال اپنا راز عیاں کرے تو یہی اَزل ہے، یہی اَبد ہے۔ یہی لمحہ ہمارے فکر و عمل کی آخری حد ہے۔

مستقبل کو ماضی میں بدلنے والا لمحہ اگر چاہے تو ماضی کو مستقبل بنا دے۔ یہ کارساز لمحہ ہے۔ یہ سراپا راز لمحہ ہے۔ اِسی لمحے میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے، جب اِنسان ایسی محفل میں پہنچ جاتا ہے جو آج کی محفل نہیں۔ لمحہ پھیل جاتا ہے اور بعید، قریب ہو جاتا ہے۔ لمحے کا پھیلاؤ عجب ہے۔ اِنسان کو زمان و مکاں سے نکال کر لامکاں تک لے جاتا ہے—یہی حال کا مختصر لمحہ! —اور پھر اِنسان دیکھتا ہے—اگر اِنسان خسروؒ ہو تو اُسے نظر آتا ہے کہ خدا خود ہی میرِ مجلس ہے اور شمعِ محفل حضور پُر نور ﷺ۔ یہ نظارہ کسی ماضی یا مستقبل کی بات نہیں، یہ حال ہے۔ حال کا لمحہ، تابناک لمحہ، مختصر لمحہ، خوش نصیب لمحہ!

حال کے لمحے کو پہچاننے والے دُنیا میں آنے والے زمانوں کو جاننے والے ہوتے ہیں۔ حال آگاہ، مستقبل آگاہ ہو جاتا ہے۔ حال آشنا، ماضی آشنا ہے۔ حال کا اِدراک، اِدراکِ حقیقت ہے اور اگر حقیقت کا اِدراک میسر آجائے تو تخیل کا اِدراک مل جاتا ہے، یعنی مستقبل کا اِدراک آسان ہو جاتا ہے۔ حال سے باخبر ہونے والا یادوں کو پہچانتا ہے، یعنی ماضی سے باخبر ہو جاتا ہے۔ حال آشنا کے سامنے ماضی اور مستقبل کے جلوے موجود رہتے ہیں۔

یہ تو صرف حال آشنا کی بات ہے اور جو اِنسان حال پر قدرت حاصل کر لے، اُس نے ماضی اور مستقبل کو مسخر کر لیا۔ اُس کا مستقبل اُس کی اِطاعت میں آئے گا۔ حال پر قدرت حاصل کرنا اِتنا مشکل ہے جتنا زمین و آسمان کے حصار سے نکلنا۔ انسان ہرگز نہیں نکل سکتا، مگر جسے اللہ توفیق دے۔ دَراصل اِنسان کی سب قدرتیں توفیقِ الٰہی کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ وہ جسے چاہے، جو چاہے، جب چاہے، بنا دے۔ وہ جب چاہے یتیموں کو پیغمبر بنا دے۔ چاہے تو شاہوں کو دَربدر کر دے۔ وہ چاہے تو مکڑی کے کمزور جالے سے قوی دلیل پیدا کر دے۔ چاہے تو مُقرّب کو معتوب کر دے۔ چاہے تو عاصی کو بخش دے۔ وہ جسے چاہے، اُسے کیا سے کیا بنا دے۔ غافل کو راز آشنا کر دے، جاگنے والے کو محروم کر دے اور سونے والے کو سرفراز کر دے۔ یہ سب اُس کے اپنے کام ہیں۔

حال اُس کا، مستقبل اُس کا، ماضی اُس کا، اِنسان اُس کا، اِنسان کا دِل اُس کا — اپنا بنایا ہوا۔ جس دل کو چاہے، محرمِ راز کر دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور کرتا ہے —!

ہم ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں میں مقیّد ہیں۔ اُس کے ہاں ایک ہی زمانہ ہے۔ وہ ہمیشہ ایک حال ہے۔ اُس کے جلوے بدلتے ہیں۔ اُس کی ذات نہیں بدلتی۔ اُس نے جس پر فضل کیا، وہ بھی قائم کر دیا گیا۔ اُس کا حال بھی ماضی اور مستقبل سے واصل ہو کر ایک زمانہ ہو گیا — ہر زمانہ — ہر دَور، ایک دَور — ایک زندگی، ایک اکائی، ایک وَحدت، ایک جامعیت! اِس بات کا کوئی فارمولا نہیں۔ لمحے میں صدیاں دیکھنے والے ذرّے میں صحرا دیکھتے ہیں، قطرے میں قلزم دیکھتے ہیں۔ اِس میں صرف کسی کے ہو جانے کی بات ہے۔ بس اِتنی سی دیر لگتی ہے جتنی غالؔب کو اِس شعر کے کہنے میں:

ے دلِ ہر قطرہ ہے، سازِ اَنا البحر
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

ایک بار دِل سے تسلیم کر لیا جائے تو حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ پردہ اُٹھ جائے تو ماضی، حال اور مستقبل ایک شے کے نام ہو کے رہ جاتے ہیں، اور وہ شے اَمرِ الٰہی ہے۔ اَمرِ الٰہی کو توفیقِ الٰہی سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔

۩۩۩

بلاسبب

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اِس دُنیا میں نہ کوئی انعام ہے نہ سزا، یہاں صرف وجوہات ہیں اور نتائج۔ اِنسان کا ہر عمل یا تو کسی سبب کا نتیجہ ہے یا کسی نتیجے کے لیے نیا سبب ہے۔ اَسباب و نتائج کا یہ سلسلہ زندگی کا مقدّر بن کے رہ گیا ہے۔ اِنسان جتنا عمل کرے گا، اُتنا ہی حاصل کرے گا۔ محنت کرنے والا کامیاب ہو گا۔ تلاش کرنے والا حاصل کرے گا۔ مانگنے والے کو دیا جائے گا۔ کھٹکھٹانے والے کے لیے دروازہ کھولا جائے گا۔ بس عمل کرتے جاؤ، نتیجہ حاصل کرتے جاؤ۔ بُرے اعمال کو بُرا نتیجہ ملے گا، اچھے اعمال کو اچھا!!

زِندگی کا یہ تصوّر اپنی جگہ درست، لیکن زِندگی اپنے دامن میں اسباب و نتائج کے رِشتوں کے علاوہ بھی بہت کچھ رکھتی ہے۔ زندگی میں بے سبب نتائج اور بے نتیجہ اسباب کی اتنی کثرت ہے کہ اسباب و نتائج کا سلسلہ قائم رہنا مشکل ہے۔ یہ تو روز مرّہ کا مشاہدہ ہے کہ یکساں محنتیں یکساں نتیجہ پیدا نہیں کرتیں۔ ایک مارکیٹ میں دکان دار صبح سے شام تک یکساں محنت کرتے ہیں اور شام کو نتیجہ یکساں نہیں ہوتا، ایک کو نقصان اور دوسرے کو نفع۔ اپنے گھر کو پُرسکون بنانے کے لیے سب کوشش کرتے ہیں، لیکن سارے گھر پُرسکون نہیں ہوتے۔ محنت ہوتی ہے، لیکن سکون نہیں ملتا۔

سکون یا اطمینان محنت کا نتیجہ نہیں، یہ نصیب کی عطا ہے۔ اگر اِنسان کی زِندگی میں نصیب، مقدّر یا منشائے الٰہی کا دخل نہ ہوتا تو اسباب و نتائج کا رشتہ سائنس کے اصول کی طرح ہمیشہ قائم رہتا، لیکن ایسا نہیں۔ اِس لیے کہ اِنسان کے عمل میں فطرت کا دخل ہے،

گردشِ روزگار کا دخل ہے، حالاتِ زمانہ کا دخل ہے۔

کوششیں اپنی ذات تک تو نتیجہ دے سکتی ہیں، لیکن جب اِنسان دُوسرے اِنسانوں سے متعلق ہوتا ہے تو کوشش کے باوجود متوقع نتائج بر آمد نہیں ہوتے۔ اِنسان اپنے راستے پر صحیح سفر کر رہا ہو، تو بھی اُسے کسی اور کی غلط رَوی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حادثہ، سبب کو نتیجے سے محروم کرنے والے واقعہ کا نام ہے، اور زِندگی حادثات کی زَد میں رہتی ہے۔ یہ چراغ ہمیشہ نامعلوم آندھیوں کی زد میں رہتا ہے۔ اِسی طرح اگر نصیب ساتھ دے اور کوئی شعیبؑ میسّر آئے تو شبانی کو کلیمی بنا دیا جاتا ہے۔ اِس میں محنت کا اِستحقاق نہیں۔ یہ اَزلی نصیب ہے۔ یہ قدرت کے اپنے جلوے ہیں۔ فطرت کی اپنی عطا ہے۔ مالک کی اپنی منشا ہے۔ ہر محنت کرنے والا بامراد نہیں ہو سکتا۔ دُنیا میں بے شمار محنتیں رائیگاں ہو کر رہ گئیں۔ بے شمار مسافر منزلوں سے محروم رہے۔ بے حساب اَسباب اپنے نتائج نہ دیکھ سکے۔ کم و بیش ہر اِنسان زندہ رہنے کے لیے کوشش کرتا ہے اور زندہ رہنے کی کوشش ہی نے اِنسان کو موت تک لانا ہے۔ یہ ایسا نتیجہ ہے جو اپنے سبب کے بالکل برعکس ہے۔ زندگی پیدا کرنے والے کا یہ اِرشاد ہے کہ وہ جسے چاہے عزّت دے، جسے چاہے ذِلّت دے۔ وہ جسے چاہے ملک عطا کرے اور جسے چاہے معزول کر دے۔ وہ جسے چاہے بے حساب رزق دے، جسے چاہے اُس کے گناہ معاف فرما دے اور اُس کی سابقہ برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دے۔ جسے چاہے، جب چاہے پیدا فرما دے اور جب چاہے اُسے واپس بلا لے۔

خالق کا عمل اِنسانی زِندگی میں شامل رہتا ہے اور خالق کا عمل کسی سبب کا محتاج نہیں۔ وہ خود مُسبّب ہے اور قادرِ مطلق ہے۔ اِسی لیے اِنسانی زِندگی اسباب و نتائج کے فارمولے میں قائم نہیں رہتی۔ دو کسان اپنے اپنے کھیت میں ہل چلاتے ہیں۔ بیج بوتے ہیں۔ بارش کا انتظار کرتے ہیں۔ بادل برستے ہیں۔ ایک کھیت سیر اب ہو جاتا ہے اور دوسرا خشک رہتا ہے۔ یہ عمل ہر سطح پر ہے۔ زندگی میں ایسے واقعات بھی دیکھے گئے ہیں کہ ایک سبب کبھی ایک نتیجہ پیدا کرتا

ہے اور کبھی دوسرا نتیجہ — پہلے سے بالکل مختلف اور برعکس! زِندگی کو سائنس بنانے والے، زِندگی کو فارمولا بنانے والے، زِندگی کو ریاضی کے اصول بنانے والے لوگ زِندگی کی نغمگی، زِندگی کے حُسن، زندگی کے لطف اور زِندگی کے باطن کی جلوہ گری سے اکثر محروم رہتے ہیں۔

زِندگی صرف اصول ہی نہیں، حُسن بھی ہے، محبّت بھی ہے، جلوہ بھی ہے۔ ہمارے اعمال کیا اور ہمارے نتیجے کیا! اُس کا فضل نہ ہو تو انسان اپنے عمل کے زعم ہی میں تباہ ہو جائے۔

کیا گمراہ ہونے والا راستہ طے نہیں کرتا؟ کیا گنہگار محنت نہیں کرتا؟ کیا غلطی عمل نہیں ہے؟ کیا ملاوٹ کرنے والا محنت نہیں کرتا؟ کیا ساری سیاسی جماعتیں محنت نہیں کرتیں؟ کیا کچھ محنتیں رائیگاں نہیں جاتیں؟ کیا ہر سبب نتیجہ دے سکتا ہے؟ کیا ہر بیج اُگتا ہے؟ کیا ہر عالم دانا ہوتا ہے؟ کیا ہر سفر آسودۂ منزل ہوتا ہے؟ کیا مخلص دوستوں کا میسّر آنا کسی سبب کا نتیجہ ہے؟ کیا حالاتِ زمانہ کا سازگار ہونا ہمارے عمل کا نتیجہ ہے؟ کیا خوبصورت چہرہ اِنسان کا اپنا عمل ہے؟ کیا مکھّی نے محنت کر کے شہد بنانے کا فارمولا حاصل کیا ہے؟ کیا سیّارے اور ستارے سفر کرتے کرتے تھک تو نہیں گئے؟ کیا چاند اور سورج کسی اور سبب کے نتائج ہیں یا کسی اور نتیجے کے اسباب؟ کیا بنانے والے نے زندگی میں دخل دینا چھوڑ دیا ہے؟ کیا علاج نے بیماری کو مسخّر کر لیا ہے؟ کیا دَوا سائنس بن گئی ہے؟ کیا دُعا کی ضرورت ختم ہو گئی ہے؟ کیا اِنسان بھول گیا ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے اُس کا ذکر تک نہیں تھا اور آج سے کچھ عرصہ بعد پھر اُس کا ذکر تک نہ ہو گا؟ کیا اِنسان سبب اور نتیجے کے حوالے سے فطرت اور فاطر سے باغی تو نہیں ہو رہا؟ کیا غرورِ نفس اِنسان کو اُس مقام تک لے آیا ہے جہاں وہ اپنے بازوؤں کو قادر سمجھ رہا ہو؟ اپنی قوت کو اپنا مقدّر سمجھ رہا ہو؟ کیا وہ جانتا نہیں کہ پسند کی جانے والی ہر چیز اُس کے لیے مفید نہیں اور ناپسند ہونے والی ہر چیز اُس کے لیے مضر نہیں؟ کیا اِنسان کو یاد نہیں کہ فرعون کے تمام "اسباب" اور اُس کی تمام تر کوشش، اُس کے لیے وہ نتیجہ مرتب نہ کر سکی جس کی اُسے ضرورت تھی؟

یہی عجیب بات ہے کہ سبب فرعون ہو تو نتیجہ موسیٰؑ نکلتا ہے، اور یہی بات اہلِ ظاہر

کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جہاں سبب اور نتیجہ کی سائنس ختم ہوتی ہے،وہاں سے رضا اور نصیب کی حد شروع ہوتی ہے — اور رضا، رضا ہے،چاہے تو محنت کو مراد دے اور چاہے تو محنت کے بغیر بامراد کردے۔

بے عقیدہ اِنسان صرف سبب کو مانتا ہے اور صاحبِ عقیدہ اِنسان مسبّب پر ایمان رکھتا ہے۔ بے عقیدہ اِنسان عوام سے قوّت مانگتا ہے۔ صاحبِ ایمان جانتا ہے کہ طاقت کا سرچشمہ اور قوّت کا مرکز اللہ کے علاوہ کوئی نہیں۔ اسباب و نتائج کا کھیل رضا اور قضا کی زد میں رہتا ہے۔ اپنے اعمال کو دُعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا جائے۔ دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے، لیکن گرداب سے نکلنے کے لیے دُعا کا سفینہ چاہیے۔

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں

کرگس وشاہین اپنی بلند پروازی کے کسی دائرے میں ایک ساتھ ہو گئے۔ وہ پاس پاس، ساتھ ساتھ، فضامیں تیرتے چلے جا رہے تھے۔ اُن میں گفتگو کا ہونا فطری اَمر تھا۔

شاہین نے کہا" بھئی! کیسی ہے یہ فضائے نیلگوں، رِدائے صبح وشام، یہ وُسعتِ نگاہ، یہ بلند پروازی اور اِس کے ساتھ یہ بلند فکری وبلند نظری!!"

کرگس، جو اپنے خیال میں ڈوبا ہوا نظریۂ ضرورت کے متعلق سوچ رہا تھا، بولا: "ہاں بھئی! بلندی ہی بلندی ہے، لیکن بلندی اور صرف بلندی ہی تو زِندگی نہیں۔ زِندگی زِندہ رہنے کا عمل بھی تو ہے۔ اِس میں اور بھی ضروریات ہیں۔ وسعتِ نگاہ اپنی جگہ پر بجا، لیکن ضرورتِ وجود سے کیا اِنکار۔ یہ بلند پروازی مجھے میری ضرورت سے محروم کر رہی ہے۔ دیکھو بھئی! خالی بلندی اور خالی پیٹ ہمیں کیا دے سکتے ہیں؟"

شاہین نے کہا: "دیکھو! وہ دُور اُفق پر جھلمل جھلمل کرنے والی شے کیا ہے۔ کتنا خوبصورت ہے یہ منظر، کتنی لطیف ہے یہ فضا۔ آؤ بھئی! ستاروں کی دُنیا میں چکر لگائیں۔ آؤ دیکھیں! سورج کہاں سے نکلتا ہے، کہاں ڈوبتا ہے۔ آؤ! رازہائے سَر بستہ دریافت کریں۔ آؤ! معلوم کریں کہ یہ سب کیا ہے، یہ آبادیاں کیا ہیں، کیوں ہیں، کون ہے جو ہر شے کو حرکت عطا کرتا ہے، کس نے سب کو اپنے اپنے محور و مدار میں جکڑ رکھا ہے؟ آؤ تو ذرا دیکھیں! اُس کا اپنا مدار کیا ہے؟ طاقت صرف طاقت ہے تو اُس کی اپنی ضرورت کیا ہے؟ اگر اُس کی بھی اپنی کوئی خواہش ہے تو وہ طاقت کیا ہے اور اگر اُس کی اپنی کوئی ضرورت نہیں تو یہ سب ظہور غیر ضروری

ہے۔ آؤ! اِس راز سے پردہ اٹھائیں‘‘۔

کرگس نے شاہین کی بات سنی تو بڑے غور سے، لیکن اُس بات کو سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کے بجائے اُسے اپنی مردار ہنسی کے حوالے کر دیا اور کہا: ’’اِتنی دُور کی باتیں نہ سوچا کرو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کب سے بھوکا پیاسا تیرے ساتھ چکر لگا رہا ہوں اور بھوک سے مجھے خود چکر آ رہے ہیں۔ زِندگی کا کوئی راز نہیں۔ یہ صرف زِندگی ہے، اِسے گزارنا ہے۔ بہر صورت زِندگی صرف آگ ہے اور یہ آگ زِندگی کے ہر حصّے میں ہے، دِل میں، دماغ میں، نفس میں اور سب سے بڑھ کر پیٹ میں۔ پیٹ کی آگ کو بجھانا آسمانوں کی پرواز سے بہتر ہے۔ یہ بلند پروازیاں مہمل ہیں، اگر پیٹ خالی ہو۔ تم ستاروں اور سورجوں کا کھوج لگاؤ۔ وہ تمہاری منزل ہو گی، لیکن میری منزل میری نظر کے سامنے ہے۔ وہ دیکھو ایک مرا ہوا گھوڑا پڑا ہے۔ میری برادری کے لوگ جمع ہو رہے ہیں، اِس لیے میں بھی نظریۂ ضرورت کے ماتحت اپنی منزل کی طرف چلا ہوں۔ تجھے اور تیری پرواز کو خدا حافظ۔‘‘

یہ کہتے ہُوئے کرگس نے ایک سیدھا غوطہ زمین کی طرف لگایا اور آناً فاناً اپنی منزلِ مردار تک پہنچ گیا، اور شاہین بدستور رازہائے سربستہ کی تلاش میں، بلند سے بلند تر کی جستجو میں، وحدت و یکتائیِ خیال کے تصوّر میں، زِندگی اور ماورائے زِندگی کو جاننے کی آرزو میں سرگرداں ہے۔ وہ عالمِ تحیّر میں گم ہے۔ اُس کے سامنے صرف فاصلے اور وسعتیں ہیں لیکن وہ پرواز میں ہے۔ اُس کی منزل — وہ منزلوں سے آزاد ہے۔ منزل، قید ہے اور پرواز، آزادی ہے۔

کرگس اور شاہین اِکٹھے پرواز کریں، تب بھی الگ الگ راستوں کے مسافر ہیں۔ اُن کو ساتھ ساتھ بھی دیکھا جائے، تو بھی اُنہیں ساتھی نہ سمجھا جائے۔ یہ ہم پرواز تو ہو سکتے ہیں، لیکن ہم مَشرب نہیں، ہمراز نہیں۔ ایک کا مقصد مکاں، دُوسرے کا مقصد لامکاں۔ ایک محدود، دُوسرا لامحدود۔ ایک کا رِزق مردار، دُوسرا دِل کا شہنشاہ۔ ایک موت سے وابستہ ہے، دُوسرا آزادی ہی آزادی کے ساتھ۔

زندگی کے ہر شعبے میں کرگس اور شاہین ساتھ ساتھ دیکھے جاتے ہیں — ہر شعبے میں، ہر طبقے میں، ہر گروہ میں، ہر درجے اور زاویے میں۔

فوج میں بھی شاہین ہیں، کرگس ہیں۔ شہباز وہ جرنیل ہے جس کا مدعا ملک کے علاوہ کچھ نہ ہو اور گِدھ جرنیل وہ ہے جس کا مُدعا اپنا پیٹ بھرنا — اپنا دوزخ۔ کبھی کبھی اپنا حاصل ملک کی محرومی بن سکتا ہے۔ ایسے جرنیل بھی گزرے ہیں جن کا سب سے اچھا کام یہ تھا کہ وہ گزر گئے۔ اُنہیں زِندگی میں صرف ایک ہی چیز زیب دیتی تھی کہ بس زِندگی کو چھوڑ دینا۔

مسلمانوں کے قافلے میں شاہینوں کے بسیروں پر کرگسوں کا قبضہ سا ہو چکا ہے۔ مشائخ کرام ہی کو لیجیے۔ بس نازک بات کو نہ ہی بیان کیا جائے، لیکن یہ بات اِتنی نازک بھی نہیں کہ اقبالؔ بہت پہلے اِسے کئی بار کہہ چکا ہے کہ خانقاہ میں صُوفی خالی ہے۔ خرقۂ سالُوس کے اندر مہاجن ہے۔ یہ طریقِ خانقاہی اِصلاح طلب ہے — اور کتنے ایسے اقوال!

مشائخ، پیروکار ہیں اُن صادق مشائخ کے جن کے نام سے کام نکلتے رہے ہیں لیکن آج اُن سچّے بزرگوں کے آستانوں پر کہیں کہیں جھوٹے دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ کوئی اِمتاراز بھی نہیں۔ ہر شیخ اپنے علاوہ سب کو غیر مصدقہ سمجھتا ہے۔ اِسی طرح تمام مشائخ دوسرے تمام مشائخ کی رُو سے غیر مصدقہ ہیں۔ اگر سارے سچّے ہوں، سارے شاہین ہوں تو ملک میں جو کچھ ہو رہا ہے، نہ ہو۔ شہبازِ طریقت وہ شیخ ہے جو کم اَز کم قصرِ سُلطانی کے گُنبد پر نشیمن نہ بنائے۔ حق گو اور قصیدہ گو میں جو فرق ہے، اُسے قائم رہنے دیا جائے۔

علمائے کرام کا تذکرہ کیا کیجیے۔ اُن کا کام بس اُتنا ہی ہے، جتنا یہ کر رہے ہیں۔ بس اُن کا نام رکھنا باقی ہے — علمائے حق یا علمائے سُو!

علمائے حق، کلمۂ حق کہنے کے لیے پیٹ کی ضروریات کو مُقدّم نہیں سمجھتے۔ وظیفہ خوار عالمِ دِین نہ عالم ہے، نہ دِین آشنا۔ وہ صرف ایجنٹ ہے اور ایجنٹ عالمِ حق نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اِس طبقے میں شاہین بھی موجود ہیں اور کرگس بھی۔ وہ علماء جو واقعی علمائے حق ہیں، بلند

نگاہ اور بلند پرواز ہیں۔ وہ ظاہر اور باطن کا فرق نہیں رکھتے۔ وہ مساجد کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعریف کے لیے وَقف سمجھتے ہیں۔ اِنسانوں اور حکمرانوں اور ہر دَور کے حکمرانوں کی ہر حال میں قصیدہ سرائی عالمِ حق کا کام نہیں ہے۔

اِسی طرح اساتذہ، ادیب، دانشور، سیاست دان اور بڑے تجّار اور کارخانہ دار سب میں کرگس اور شاہین ہیں۔ ہر سطح پر یہ کھیل ہو رہا ہے، بلکہ ہر شخص کے اندر بھی یہ کھیل ہو سکتا ہے۔

جب انسان پیٹ اور صرف پیٹ بن جائے تو وہ کرگس صفت ہو جاتا ہے۔ جب اُسے ذوقِ پرواز ملے، وہ ایسے رزق کو بھی نگاہ میں نہیں لاتا جس سے اُس کی پرواز میں کوتاہی آئے۔ شاہین صفت اِنسان مُردار نہیں کھا سکتا۔ وہ صرف پرواز ہے اور پرواز بھی اُس کے ساتھ، اُس کی طرف جس نے قوّتِ پرواز دی۔ جس کی کوئی منزل نہ ہو، اُس کی منزل اُس کے ہمراہ ہوتی ہے۔

کرگس اور شاہین، شاہین اور کرگس معاشرے میں باہم موجود رہتے ہیں۔ دونوں کی پرواز اِسی ایک فضا میں ہی رہتی ہے۔ مقصد کا جہان الگ الگ ہے۔ ایک آسمانوں پر جھپٹتا ہے، دُوسرا مُردار پر لپکتا ہے۔ اِن کے مزاج الگ، اِن کی داستان الگ۔ شاہین کی بات کرگسوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ شاہین کا خواب ہو تو تعبیر کرگسوں کے بس میں نہیں۔ شاہین کا مُدعا شاہین ہی کو معلوم ہو سکتا ہے۔ پاس رہنے والے، دُور کے فاصلوں کے مسافر ہوتے ہیں۔ شاہینوں کے مساکن پر اگر کرگسوں کا بسیرا ہو جائے تو سمجھ لیجیے قیامت کی نشانی ہے۔ اگر بلند مرتبت بلند نگاہ نہ ہو تو وہ وقت اچھا نہیں ہوتا۔ شاہین کے خواب کی تعبیر اور تفسیر کے لیے کوئی شاہین ملے تو بات بن جائے، ورنہ یہ بات ہجومِ کرگساں کے بس میں نہیں۔

ع کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

گردشِ تیز ہے ساقی

ترقی کا زمانہ ہے، تعمیر کا دَور ہے، تیزی کا وقت ہے، تعجیل کی گھڑی ہے۔ ہر شے بھاگے چلی جا رہی ہے۔ گردشِ زمان و مکاں تیز تر ہے۔ اِنسان مشین ہے، مشین کا پرزہ ہے، جلد باز ہے، جلد رفتار ہے۔ اس کے سامنے لامحدود فاصلے ہیں اور وقت محدود ہے، اِس لیے وہ دوڑتا ہے اور دوڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ اِنسان کو یہ تو معلوم ہے کہ اُسے جلدی جانا ہے، لیکن کہاں جانا ہے، یہ معلوم نہیں۔

اِنسان شاید تعمیرِ حیات کے لیے جلدی کرتا ہے، اُسے فوری طور پر زندگی مکمل کرنا ہے اور وہ جلدی جلدی اِسے بناتا ہے، بناتے بناتے بگاڑتا ہے، اور اُس کے ہاتھ سے زندگی یوں نکل جاتی ہے جیسے ہاتھ سے کبوتر اُڑ جائے، یا ہاتھوں کے طوطے اُڑ جائیں۔

اِنسان فطرتاً جلد باز ہے۔ وہ آہستہ رَوی یا میانہ رَوی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ایک ہی دِن میں سارے کام ختم کرنا چاہتا ہے۔ پورے تیس دن کے طویل انتظار کے بعد اُسے تنخواہ ملتی ہے اور اسے وہ ایک ہی دِن میں خرچ کر دیتا ہے، اور پھر وہی اِنتظار — تنخواہ کے علاوہ آمدن کا اِنتظار — جائز آمدنی اور ناجائز آمدنی کا اِنتظار — اِنسان بھاگتا ہے جیسے اُس کے اندر آگ سی لگی ہوئی ہو — جب خطرہ اندر ہو، تو باہر کی رفتار اسے کیسے ٹالے گی؟

تیز رفتاری ہی شاید ترقی کا دوسرا نام ہے! تیز رفتاری نے فاصلے سمیٹ لیے ہیں — اِنسان، اِنسان کے قریب آ رہا ہے — یہ الگ بات کہ وہ اپنے آپ سے دُور ہو رہا ہے۔ ہر شے ہر دوسری شے کے قریب ہے۔ یہ تیز مسافرت، یہ جہاز، یہ اِنگلستان، یہ امریکہ، یہ افریقہ،

یہ پاکستان اور پھر یہ زندگی — اور یہ رہا قبرستان! ہر سفر جلدی کا سفر ہے۔ کہیں قیام ہی نہیں — تیز رفتاری کی منزلوں میں کوئی مقام بھی تو نہیں — کہیں کوئی پڑاؤ نہیں۔ زمین سے آسمان تک کے فاصلے طے ہو رہے ہیں — برسوں کی مسافتیں منٹوں میں طے ہوتی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے چاند، سورج، ستارے، سیّارے سب زمین پر اُتر آئے ہوں — یا زمین آسمان پر جا پہنچی ہو۔

سائنس نے اِنسان کو رفتار دی ہے لیکن یہ رفتار بے جہت و بے سمت ہے۔ آج کی راہیں کوئے جاناں کو نہیں جاتیں۔ آج کا اِنسان اپنے آپ سے فرار چاہتا ہے۔ اپنے جامے سے نکلنے والا اِنسان اپنی بے مائیگی کا احساس نہیں کرتا۔

وسیع و بسیط خلا اُسے کسی بنانے والے کی طرف متوجہ نہیں کرتی! انسان جلدی جلدی محنت کرتا ہے — اُس آدمی کی طرح جو گھاس کی رَسّی بُن رہا تھا اور اُس کے پاس اُس کا گدھا بُنی ہوئی رَسّی کو کھاتا جا رہا تھا — برسوں کی محنت کے بعد اُس کی کُل پُونجی رسّی کا اُتنا حصّہ تھی، جو اُس کے ہاتھ میں تھی — باقی گدھا کھا چکا تھا۔ اِنسان محنت کرتا جاتا ہے اور اُس کی محنتیں مٹتی جاتی ہیں۔ اس کا حاصل کیا ہے — اس کی موجود زندگی — باقی سب لامحدود ماضی کی نذر ہو جاتی ہے۔ محسوسات سے محروم اِنسان معلومات کے سفر پر روانہ ہے —!! انجام نہ جانے کیا ہو گا!

اِنسان فطرتاً عجول بَر وزنِ جہول ہے۔ اِنسان نے ذرّے کا دِل چِیر کر طاقت دریافت کی ہے لیکن ذرّے میں طاقت پیدا کرنے والے کو دریافت نہیں کر سکا۔ اِنسان نے آسمانوں کے راستے دریافت کیے ہیں لیکن اُسے دِل کا راستہ نہیں ملا — باہر کی کائنات نے اِنسان کو اندر کی کائنات سے غافل کر رکھا ہے۔

خارجی کائنات میں رفتار ہے، گردشیں ہیں، عجلت ہے۔ زمان و مکاں کی وسعتوں میں ہر شے تیزی سے متحرک ہے۔ اِنسان اِس حرکت سے خود ہی متحرک ہو جاتا ہے۔ وہ لپکتا ہے ستاروں پر، وہ دوڑتا ہے سایوں کے پیچھے، بھاگتا ہے سرابوں کے تعاقب میں، وہ چاہتا ہے کہ وہ رازہائے سربستہ معلوم کر لے — لیکن اُسے معلوم نہیں کہ وہ خود ہی کلیدِ اَسرار ہے، وہ خود

شاہکارِ تخلیق ہے، حسنِ لازوال کا مُرقّعِ جمال ہے — جب تک وہ اپنا راز دریافت نہ کرے وہ رازِ کائنات معلوم نہیں کر سکتا۔ اس کا بیرونی سفر تیز رفتار ہے لیکن اندرون کا سفر کسی عجلت کا تقاضا نہیں کرتا۔ اس کی باطنی کائنات، داخلی دُنیا، ہر بیرونی، ظاہری اور خارجی کائنات سے زیادہ وسیع و عریض ہے، زیادہ خوبصورت ہے، زیادہ دِلچسپ و دِل پذیر ہے۔

رفتار کے سفر نے اِنسان کو اُس کے اصل سفر سے الگ کر دیا ہے۔ اِنسان خود ہی روبوٹ بن کے رہ گیا ہے۔ وہ ملک ملک پھرتا ہے، سکون کی تمنّا میں — شہر شہر، نگر نگر چھانتا ہے، دولت کی تلاش میں۔ وہ ملکِ دلبری کا راستہ نہیں جانتا، جہاں دولتِ تسکین کے خزانے مستور ہیں۔ تیز رفتار اِنسان سایۂ دیوارِ یار سے محروم ہے!

آج کا اِنسان تمام تر آسائشوں اور رفتاروں کے باوجود اکابرینِ سلف کے مقام تک نہیں پہنچ سکا۔ دستورِ حیات کی اَساس ماضی کے عظیم اِنسانوں نے رکھی — آج کی عمارت اُسی بنیاد پر قائم ہے — لیکن آج کا اِنسان اُس عمارت کو جلد مکمل کرنا چاہتا ہے اور تکمیلِ تہذیب اختتامِ تہذیب ہے۔

جلد رفتاری نے پہلے بھی بڑے گُل کھلائے ہیں۔ جلد بازیوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی میں جلوے دِکھائے ہیں۔ تیز رفتار جہازوں، گاڑیوں اور بسوں نے اِنسانی زندگی کو جس طرح تباہ کیا، اُس کی مثال ہی نہیں ملتی۔

آج کا عجلت باز اِنسان دُنیا کو تیزی سے ایک نئی راہ کی طرف لے جا رہا ہے۔ آج کے اِنسان کو جلد بازی نے ایک عجب خوف میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ خوف محض اندیشۂ خیال نہیں — یہ خوف ایک حقیقت بن کر اُفقِ زندگی پر طلوع ہو رہا ہے۔ یہ خوف ہے ایک تیسری جنگِ عظیم کا، یہ جنگ بین السّیاروی جنگ ہو گی — اور اِس جنگ کی تعریف صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اِس کے بعد کوئی اور جنگ نہیں — دنیا میں کوئی اِنسان ہی نہ ہو گا تو جنگ کون لڑے گا، کس کے ساتھ، کس کے لیے!

تیز رفتار ارتقاء بظاہر اِنسان کو اِنسان کے قریب لایا ہے لیکن اصل میں خطرہ خطرے کے قریب آیا ہے!

آج کی مہذب و متمدن دُنیا میں، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ دُنیا میں، پسماندگی کا قائم رہنا اِنسان کے لیے بڑا پیغام ہے۔

اِنسان کے اِنفرادی وجود کی طرح، کسی ایک حِصّے کا حد سے بڑھ جانے کا مطلب وجود کی ہلاکت ہے — اِسی طرح ایک قوم یا ایک سماج کا حد سے نکل جانا وجودِ آدم کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

جہاں رفتار بڑھی ہے، وہاں فاصلے بھی کروڑوں نوری سالوں کے ہیں۔ نتیجہ پھر وہی ہو گا، اِنسان بے بس ہو کر بے دم ہو جائے گا — ابھی تو یہ کہکشاں بھی اِنسان کی دَسترس سے باہر ہے اور ابھی لاکھوں کہکشائیں ہیں، دریافت کرنے والی — لاتعداد سیارے بھیجے جائیں تو بھی لامحدود فاصلے نہیں مٹتے — اور اِنسان کی زندگی — چند محدود ایّام کے علاوہ کچھ نہیں۔ ترقی ایک ایسے جہاز کی طرح ہے جو سطحِ سمندر پر اپنے آپ کو موجوں سے محفوظ کر لیتا ہے۔ اِس کا سفر تیز رفتار تو ہے لیکن اِس جہاز کے نصیب میں منزل کا نام ہی نہیں۔ بے نام اور بے نشان منزلوں کی طرف گامزن ہونے والا اِنسان اپنی رفتار پر کیا ناز کر سکتا ہے!

گھر سے قبرستان تک کا فاصلہ ہے، کتنی رفتار درکار ہے؟ تقریباً پچاس سال کی مسافت ہے — تیز رَوی کیا کرے گی! آج بھی دن چوبیس گھنٹوں کا ہے، سال بارہ مہینوں کا — موسم اپنی پرانی رفتار سے بدلتے ہیں، بچپن اپنی رفتار سے کٹتا ہے، جوانی کے ایّام اپنی رفتار سے گزرتے ہیں اور پھر بڑھاپا — اِنسان کو کوئی رفتار بھی تو پناہ نہیں دے سکتی۔ وہ سمندروں میں یا سیاروں میں چھُپ جائے تو بھی اُسے زِندگی کا قرض واپس کرنا ہے۔ سانس کی ڈوری راستے میں ہی کٹتی ہے — اِنسان کے گرد مجبوریوں اور پابندیوں اور سست رَوی کا حصار ہے — اس کی تیزی اسے ہلاک کر رہی ہے۔ وہ جتنی تیزی سے علاج دریافت کرتا ہے اُتنی ہی تیزی سے نئی بیماری پیدا ہو

جاتی ہے۔ عجب حال ہے، اِس جلد باز مسافر کا — بُرا حال ہے اِس تیز رفتار شکار کا — جس کے آگے فاصلے ہیں نہ طے ہونے والے، اور جس کے پیچھے اس کی جان کا دُشمن شکاری اس کے دِن گِنتا ہُوا ہواؤں کے گھوڑے پر سوار آرہا ہے۔ اِنسان بھاگتا ہے لیکن کب تک؟ آخر اَنہونی ہو کے رہتی ہے اور نامعلوم اور بے سمت فاصلوں کا تیز رفتار مسافر خاموشی سے موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔

ترقی، یا ترقی پسندی یا اِرتقاء نے اِنسان کو کیا دیا ہے؟ آفرین ہے اِنسان کی تیز رفتاریوں پر — تحسین ہے تعجیل کے پُجاریوں کے لیے — رفتار حد سے نکل گئی، اِنسان جامے سے باہر ہو گیا!

تیز زندگی — تیز تر گردشِ خون، آخر رنگ لاتی ہے — اِنسان تو اِرتقاء کے اِمتحان میں پاس ہو جاتا ہے — بس صرف ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔

آج کا معاشرہ، تیز رفتار معاشرہ اِنسانی قدروں کا قبرستان ہے۔ بشر کی کوئی صفت آج کے بشر میں نہیں۔ فطرت کے قوانین توڑنے والا اِنسان دراصل خود کو توڑ رہا ہے اور جلدی جلدی توڑ رہا ہے۔ ابھی وقت ہے کہ وقت کی رفتار کے ساتھ چلا جائے — بے موسم پھل اور بے وقت حاصل آخر اِنسان کو نقصان پہنچائیں گے — فصلوں کو جلد اَز جلد اُگانے کی کوشش زمینوں کی توانائی ختم کر رہی ہے — اور اِس طرح حاصل ہونے والی اجناس اور پھل بے ذائقہ ہی نہیں، نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ رفتار وہی بھلی جس سے سانس نہ پھولے۔

سوال یہ ہے کہ....

کیا زندگی دینے والا زندگی واپس لینے کے علاوہ بھی اِس پر کوئی اختیار رکھتا ہے؟ اگر ہے، تو وہ کیا ہے؟

کیا خالق، مخلوق کے تجربے یا مشاہدے میں آسکتا ہے؟

کیا خالق، مخلوق کی آواز اور پکار پر اُن کی امداد کرتا ہے؟

کیا ہمیشہ ایسے ہوتا ہے؟

کیا خالق اپنے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں تخلیق کے حوالے سے کوئی امتیازی سلوک کرتا ہے؟

کیا ہر انسان کو یکساں صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے یا الگ الگ صلاحیت کے ساتھ؟

کیا بد صورت اور خوبصورت انسان ہوتے ہیں؟

کیا بد صورت کسی غلطی کی سزا کے طور پر بد صورت پیدا ہوتا ہے اور خوبصورت کسی نیکی کے دم سے خوبصورت ہوتا ہے؟

کیا پیدائش سے پہلے بھی کوئی نیکی بدی ہوتی ہے؟

کیا انسانوں کے اژدہام میں ایک آدمی اپنے ایمان کے حوالے سے اپنا امتیاز ثابت کر سکتا ہے؟

کیا ہونا اور نہ ہونا، سب کے لیے نہیں ہوتا؟

کیا ماننے والے شکست سے دوچار نہیں ہوتے؟

کیا نہ ماننے والے سرفراز نہیں ہوتے؟

کیا تسلیم کا انعام، شہادت ہے؟

کیا کمزور وجود، فاتح ہو سکتا ہے؟

کیا خالق کو نہ ماننے والے خالق کی کائنات کے مالک ہو سکتے ہیں؟

کیا اِس زمین پر باغیوں کی حکومت تو نہیں؟

کیا ایمان رکھنے والے پریشانیِ حالات کا شکار تو نہیں؟

کیا ماننے والوں کو پریشان رکھا جاتا ہے؟

فرعون باغی ہے لیکن بادشاہ ہے، موسیٰؑ دوست ہے لیکن بے دست و پا۔ کیوں؟

کیا دعائیں ہمیشہ منظور ہوتی ہیں؟ کبھی کبھی منظور ہوتی ہیں، یا کبھی نہیں؟

کیا دُعا سے وجوہ اور نتائج کے رشتے ٹوٹ سکتے ہیں؟

کیا صرف دُعا کے ذریعے وہ نتیجہ مل سکتا ہے جس پر دُعا کے علاوہ کوئی اور استحقاق نہ ہو؟

کیا بانجھ پن بار آور ہو سکتا ہے؟

کیا دعائیں گدھے کو گھوڑا بنا سکتی ہیں؟

کیا کسی پیغمبر کی کوئی دُعا نا منظور ہوئی ہے؟

کیا کسی کافر کی کوئی آرزو کبھی پوری ہوئی ہے؟

کیا ہماری محنت نصیب کے تابع ہے؟

کیا نصیب محنت کے تابع ہے؟

کیا نصیب بدل سکتا ہے؟

کیا نصیب کو بدلنے والی شے بھی نصیب ہی کہلاتی ہے؟

کیا نصیب کو نصیب بدلتا ہے؟ کیا دو نصیب ہوتے ہیں، تبدیل کرنے والا اور تبدیل ہونے والا؟

کیا بیماری دُعا سے دُور ہوتی ہے، یا دَوا سے؟

کیا وقت بدلنے کا کوئی موسم ہوتا ہے؟

کیا اُمّید اور خوف کے زمانے ہوتے ہیں؟

کیا سکون آسمانوں سے نازل ہوتا ہے، یا یہ اپنے خیال سے حاصل ہوتا ہے؟

کیا سکون خود گریزی کا نام ہے، یا بے عملی کا عمل؟

کیا ایمان والے کافروں کی بنائی ہوئی آسائشیں خرید سکتے ہیں؟

کیا امپورٹ اور ایکسپورٹ کا سارا نظام قابلِ غور تو نہیں؟

کیا یہود سے اسلحہ لے کر ہنود کے خلاف جہاد کیا جا سکتا ہے؟

کیا ایک مسلمان ملک دوسرے مسلمان ملک کے خلاف جہاد کر سکتا ہے؟

کیا مومن ہونے کے لیے کسی ادارے سے سند یافتہ ہونا ضروری ہے؟

کیا ہم کسی ایسے شخص کو کافر کہہ سکتے ہیں جو خود کو مومن کہے؟

کیا اعمال کو نیّت سے پہچانا جاتا ہے یا کہ نتیجے سے؟

کیا نیّت جاننے کا بھی کوئی علم ہے؟

کیا ظاہر اور مخفی الگ الگ علوم ہیں؟

کیا مجبور کا گناہ ہوتا ہے؟

کیا بے بس جواب دہ ہے؟

کیا پابند، آزاد کہلا سکتا ہے؟

کیا عبادت عابد کی مجبوری ہے کہ اختیار؟

کیا کائنات کی ہر شے خالق کی تسبیح بیان کر رہی ہے؟

کیا تسبیح بیان کرنے والی شے باغی ہو سکتی ہے؟

کیا سرکش کو سرکشی فطرتاً نہیں ملی؟ اگر فطری اَمر ہے تو گناہ کیسے؟

اگر ایک مسلمان ملک کسی غیر مسلم ملک کے خلاف جہاد میں مصروف ہو تو کیا دوسرے مسلمان ممالک پر جہاد فرض نہیں ہو جاتا؟

کیا مسلمان قوموں کو ایک ملّت بننے کا کبھی موقع مل سکے گا؟ کیسے؟

کیا مسلمانوں کا حج غیر مسلموں کو فائدہ تو نہیں پہنچاتا؟ حج ہمارا، جہاز اُن کے، سامان اُن کا، تجارت اُن کی۔ کیا مسلمانوں کا تیل یہودی کے ٹینکوں میں تو استعمال نہیں ہو رہا؟

کیا ہمارا مستقبل سب مسلمانوں کا مستقبل ہے؟

کیا سچّے دِین کو ماننے والے ہمیشہ سچ بولتے ہیں؟

کیا مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں؟

کیا مسلمان معاشرہ قائم ہو چکا ہے؟

کیا مسلمانوں پر اِسلام نافذ ہو چکا ہے، ہو رہا ہے، یا ہونے والا ہے یا نہیں ہو سکتا؟

کیا آج اسلام کی حالت وہی ہے جو چودہ سو سال پہلے تھی؟

کیا ترقی کرنے کے لیے مذہب کا ہونا بہت ہی ضروری ہے؟ کیا لا مذہب لوگ ترقی نہیں کرتے؟

کیا مذہب حاصل ہونے کے بعد ترقی ضروری ہے؟

کیا ترقی کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا؟

ترقی کا معیار کیا ہے؟ کافر معاشرے کی تقلید، یا مذہب پر ریسرچ؟

کیا آج کے ترقی یافتہ ممالک کوئی مذہب رکھتے ہیں؟

کیا آج کے پسماندہ ممالک میں مذہب کے چرچے زیادہ ہیں؟

گھر سے قبرستان تک کا فاصلہ طے کرنے کے لیے کتنی ترقی چاہیے؟

کیا قوم میں وحدتِ افکار اور وحدتِ کردار پیدا کرنے کے لیے عذاب کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہو سکتا؟

کیا خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی بڑی مخلوق بھی ہے جو خالق جیسا حکم رکھتی ہو؟

کیا خالق نے مخلوق کو مخلوق کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟

کیا خالق مخلوق سے ناراض ہے؟

کیا خالق مخلوق کو معاف نہیں کر سکتا؟

کیا اُس کی رحمت اُس کے غضب سے زیادہ وسیع نہیں ہے؟

اہلِ ظاہر کو اِن سوالات کے جوابات سوچنے پڑتے ہیں۔ اہلِ باطن پر جواب پہلے آشکار ہوتا ہے، سوال بعد میں بنتا ہے۔

اگر جواب معلوم نہ ہو تو سوال گستاخی ہے اور اگر جواب معلوم ہو تو سوال بے باکی ہے۔ بے باکی میں تعلق قائم رہتا ہے اور گستاخی میں تعلق ختم ہو جاتا ہے۔

اگر ہم ذہن سے سوچیں تو سوال ہی سوال ہیں اور اگر دِل سے محسوس کریں تو جواب ہی جواب۔

اگر ہم اُس کے ہیں، تو وہ ہمارا ہے — جواب ہی جواب۔ اگر ہم صرف اپنے لیے ہیں، تو ہم پر عذاب ہے، علم کا عذاب، ذہن کا عذاب — سوال ہی سوال!!

سوال دراصل ذہن کا نام ہے اور جواب دِل کا نام۔ ماننے والا جاننے کے لیے بے تاب نہیں ہوتا اور جاننے کا متمنّی ماننے سے گریز کرتا ہے۔

شک سوال پیدا کرتا ہے اور یقین جواب مہیا کرتا ہے۔ شک یقین کی کمی کا نام ہے اور یقین شک کی نفی کا نام۔ یقین، ایمان ہی کا درجہ ہے۔

آسمانوں اور زمین کے تمام سفر سوالات کے سفر ہیں، لیکن دِل کا سفر جواب کا سفر ہے۔ اِن سوالات کے جوابات دانشوروں سے نہ پوچھیں، اپنے دِل سے پوچھیں — اُس دل سے، جو گداز ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے!!

ہم کیا ہیں؟

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ شاید نہ کہہ سکوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں، شاید وہ میرا مقصد ہی نہ ہو۔ یہی تو مجبوری ہے اور یہی میرے عہد کی پہچان ہے۔ ہم ایک کرب ناک صورتِ حالات سے گزر رہے ہیں۔ اِنسان اپنے اصل سے کٹ چکے ہیں اور الفاظ اپنے معنی سے ہٹ چکے ہیں۔ ہم لوگ الگ الگ جماعت ہیں اور یوں وحدتِ قوم، جمعیت التفریق بن کر رہ گئی ہے۔

ہم مصروف ہیں لیکن ہماری مصروفیت بے معنی ہے۔ ہم دفتروں میں کچھ اور ہیں اور گھروں میں کچھ اور۔ ہم وطن کی تعمیر کی بجائے اپنے مکانوں اور آستانوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہمارا اصل وطن ہماری خواہشات کا نام ہے۔ ہم اپنی اپنی اَناؤں میں رہ رہے ہیں۔ ہم بہت کچھ جانتے ہیں، ہمارے علم نے ہمیں دوسروں پر فوقیت جتلانا ہی سکھایا ہے، دوسروں کے کام آنا نہیں۔ ہم اپنی نگاہ میں خود ہی سب کچھ ہیں۔ ہم کسی پر اعتبار نہیں کرتے۔ ہم خود بھی قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔

خواب دیکھنا ہمارا مشغلہ ہے۔ ہم عظیم مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ پہلے بھی ہم ایک خواب کی پروڈکشن ہیں۔ ایسا خواب جو ابھی تک اپنی تعبیر کی تلاش میں ہے۔ مستقبل کا تصور ہمیں حال سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ ہم اپنے پیچھے ملّی المیے چھوڑ آئے ہیں لیکن ہم ہر حالت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ ہم صرف انسانوں سے سمجھوتہ نہیں کرتے۔ ہم اصول بیان کرنے والی قوم ہیں۔ دوسروں کو اصول کی تعلیم دیتے ہیں، معلّم کے لیے عمل ضروری نہیں۔ ہم

حقیقت بیان کرتے ہیں اور سننے والے اسے آگے بیان کرتے ہیں اور اِس طرح بیان جاری رہتا ہے اور عمل کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

ہمارا نظامِ فکر اِمپورٹ ہوتا ہے اور اِس طرح ہماری وابستگی الگ الگ ہے۔ ہم میں سے کچھ لوگ رُوس نواز ہیں۔ کچھ لوگ امریکہ نواز ہیں۔ کچھ لوگ چین نواز، ہند نواز اور کچھ لوگ ”حق نواز“، ہم پر ثقافتوں اور سیاستوں کی یلغار ہے۔ ہماری پسندیدہ یاترا، ہند یاترا ہے۔

ہمارے لیے وی سی آر کی بھرمار ہے۔ خدا کی مار ہے کہ ہر چوتھا آدمی ہیروئن کا شکار ہے۔ بس استغفار ہے۔ ہم خوابوں میں بلند پرواز ہیں۔ یہ الگ بات کہ ہمارے گرد دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے۔

یہ قوم غریب ہے لیکن لوگ امیر ہیں؟ کاریں ہی کاریں، راہ چلنا دشوار ہے۔ مہنگائی حد سے زیادہ اور خریداری بھی حد سے زیادہ، عجب عالم ہے۔ خطرات بیان ہو رہے ہیں لیکن کسی پر کوئی اَثر نہیں۔ بیان کرنے والے بھی اپنے عالی شان مکانوں کی تعمیر کرتے جارہے ہیں۔ جہاں الفاظ اپنے مفاہیم بدل چکے ہوں، وہاں اپنے عہد کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا عہد عجب عہد ہے۔ اِس میں کیا نہیں ہو رہا — یہ دَور تضادات کا دَور ہے۔ انسان کے اندر تضاد، اِنسان کے باہر تضاد، خود انسان ہی مجموعۂ اضداد ہے۔ آج کا اِنسان ہمہ وقت مصروف ہے۔ اُس کے پاس فرصت نہیں۔ وہ دوڑتا جارہا ہے۔ اُس کو کسی نے ایک نامعلوم منزل کی طرف گمنام سفر پر مصروف کر رکھا ہے۔ وہ سب کچھ جاننے کا دعویٰ رکھتا ہے اور دعوے کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا کہ یہی اس کی جہالت کا ثبوت ہے۔

ہمارا عہد تعمیر و تخریب کا مظہر ہے۔ نئے ادارے، نئے مکانات، نئے ماڈل، نئے آستانے اُبھر رہے ہیں اور پُرانے اور مانوس ادارے ختم ہو رہے ہیں۔ پُرانے ملبے ہٹائے جارہے ہیں اور نئے شاہکار بنائے جارہے ہیں۔ یہ دَور قدیم تہذیبی اداروں کے خاتمے کا دَور ہے۔ کل کا اِنسان عقیدتوں کا مظہر تھا، لیکن آج کا انسان ہر عقیدت اور ہر عقیدے سے آزاد ہے۔ آج کا

عقیدہ بے عقیدہ ہے۔ آج صرف ایک اِنسان کی پرستش کی جاتی ہے یعنی اپنا آپ — ہم اپنی اَنا کے پُجاری ہیں۔ ہم اپنی اِن ہی خواہشات کے آگے سجدہ ریز ہیں۔ ہم اپنے علاوہ کسی کو اہم نہیں سمجھتے۔ آج کے ماحول میں خود پسندی ہی پسندیدہ عمل ہے۔ اِنسان آئینہ دیکھتا رہتا ہے۔ وہ نہ آئینے میں اُترتا ہے، نہ اِس سے باہر نکلتا ہے۔ ہر شے میں ملاوٹ ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سوچنے میں، عبادت میں، مذہب میں، مدرسے میں، خانقاہوں میں، سیاست میں، صحافت میں، دَوا میں، دُعا میں، وفا میں، غرضیکہ ہر اَدا میں ملاوٹ ہی ملاوٹ ہے۔ جو ہے، وہ نہیں ہے۔ ہم وہ نہیں جو نظر آتے ہیں۔ ہمارا وجود اصل وجود سے مختلف ہے۔ ہمارے افکار خالص نہیں، ہماری سوچ صحت مند نہیں، ہمارے چارہ گر — چارہ گر کا لفظ بے معنی ہے۔ ہمارے قائد آج بھی صرف قائدِاعظمؒ ہی ہیں۔ اگر قائدِاعظمؒ زندہ ہو جائیں تو قائدین کی کثیر تعداد مر جائے۔ ہمارے ہاں کوئی شے بھی تو ایسی نہیں جو بھروسے کے قابل ہو — ہم محسن فراموش قوم ہیں۔ اگر آج اقبالؒ زندہ ہو جائے تو قوم کے حالات دیکھ کر صدمے سے پھر مر جائے۔ یہ قوم عجب قوم ہے۔ اِسے اپنے حال سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ ماضی کے بزرگوں کی یادیں مناتی ہے اور مستقبل کے لیے کوئی کام نہیں کرتی۔ یہ بے حسی کا شکار ہے۔ پاؤں تلے سے زمین نکلا چاہتی ہے، سر پر آسمان گرا چاہتا ہے اور یہ بی بی رانی ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ اِسے جمہوریت کا اِنتظار ہے کہ ہر بلا کو جمہوریت سے ٹالا جائے گا۔ مدّتیں گزر گئیں اور ابھی تک یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ اِس ملک کا نظامِ حکومت کیا ہو گا!! نظامِ تعلیم کیا ہو گا — نظامِ معیشت کیا ہو گا۔ نظامِ عقیدہ کیا ہو گا۔ اِسلام ہو گا تو کون سا ہو گا۔ فقہ کون سی ہو گی — زبان کیا ہو گی۔ قومی لباس کون لوگ کب پہنا کریں گے۔ صحافت کس نہج پر اُستوار ہو گی اور سیاست کا دائرہ کیا ہو گا۔ اِس ملک میں مقبول ترین بیانات وہ ہیں جن میں "گا"، "گے"، "گی" ہو۔ ہر چیز ہو گی، سب کچھ ہو گا — سب انتظامات کر لیے جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کی بگڑی بن جائے گی — سب بادل چھٹ جائیں گے۔ سب کچھ یہیں رہے گا — افسوس! ہم نہ ہوں گے۔

چارہ گروں کے لیے نوید ہے کہ مریض زیادہ دیر اُن پر بوجھ نہیں ڈالے گا۔ چاروں صوبے چاروں عناصر کی طرح ابھی ظہورِ ترتیب میں ہیں۔ منتشر ہونے کا اندیشہ خاکم بدہن بعید اَز قیاس بھی نہیں۔ ابھی جمہوریت نے گُل کِھلانے ہیں ابھی اور بھی شگوفے پھوٹیں گے۔ ہم سب کرنیں ہیں جو اپنے سورج کو مسلسل چاٹ رہی ہیں۔ یہ سورج ابھی اللہ کے فضل سے قائم ہے لیکن ہمارا عمل بد اعمالی کے سِوا کیا ہے۔ ہم نے غور کرنا چھوڑ دیا— ہم مستقل اِنتظار میں ہیں۔ کوئی آئے گا، جگائے گا، ہم سے کام لے گا—ہم عظیم قوم بن جائیں گے—لیکن ابھی نہیں شاید—!

ابھی اِسلام نے نافذ ہونا ہے۔ مسلمانوں پر اِسلام نافذ ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے— یا تو مسلمان وہ نہیں رہے، یا اِسلام وہ نہیں جو دِلوں پر پہلے دن سے نافذ ہو جاتا تھا۔ یا اللہ! ہم کہاں سے چلے تھے، کہاں آ گئے۔ میرے مولا!—ہمیں جگا—لیکن نہیں—خدا جگائے گا تو جھٹکے سے آنکھ کھلے گی۔ جس کو اِحساس نہ جگائے، اُسے کون جگا سکتا ہے۔ میرے مولا! ہماری بے حسی کو بے حیائی نہ بننے دے۔ میرے آقا! ہم نا اہل ضرور ہیں، لیکن تیرے حبیب ﷺ کے نام لیوا ہیں۔ ہم پر رحم فرما—ہمیں ہمارے فرائض سے آشنا کر۔ ہمیں ایک قوم بنا۔ ہم پر نازل فرما—اپنے کرم، اپنی رحمتیں!

ہم اِحسان فراموش قوم ہیں۔ اپنے اَسلاف کی محنتوں کو برباد کرنے والی قوم—ہم بحث کرنے والی قوم ہیں۔ ہمارے پاس بڑے اخبار ہیں اور وہ خبر کسی اخبار میں نہیں ہوتی جس خبر کی ضرورت ہے—جو خبر اہم ترین ہے۔

ہم نے اپنے آپ کو دشمن کی نگاہ سے کبھی نہیں دیکھا۔ اُس کے سامنے ہم سب ہم عقیدہ ہیں۔ دشمن یہ نہیں دیکھتا کہ شیعہ کون ہے سُنّی کون۔ ہم بھول گئے اُس عہد کو جو ہم نے اپنے آپ سے کیا تھا، قائداعظمؒ سے کیا تھا، اِقبالؒ سے کیا تھا، مسلمانانِ ہند سے کیا تھا، مسلمانانِ عالم سے کیا تھا، خدا سے کیا تھا۔ ہم سب کچھ بھول گئے۔ ہم یادداشت کھو بیٹھے ہیں۔

ہماری تاریخ بدل گئی، جغرافیہ بدل گیا، ہماری شناخت بدل گئی، تشخص مسخ ہو گیا۔ ہم، ہم نہ رہے اور پھر طُرفہ عذاب کہ ہم پر اثر بھی نہ ہوا۔

ہمارے مشائخ، خدا بھلا کرے اِن بزرگوں کا، اب ویسے نہیں جیسے اِن کے آباء تھے۔ آستانے وہی ہیں، مگر بات وہ نہیں۔ طریقت اپنے طریقے بدل گئی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سب جھوٹے ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ سب سچّے نہیں۔ کیوں نہیں؟ جھوٹے کی نشان دہی کون کرے گا؟ جب قربِ سلطان مسلک بن جائے تو راہِ سلوک مسدود ہو جاتی ہے۔ جب اہلِ باطن، اہلِ ثروت کا تزکیہ نہ کریں تو اُن کا تقرّب حرام ہے۔ جب فقراء اِسلامی ملک میں بھی اِخفاء سے کام لیں تو مصلحت اندیشی ہے اور مصلحت اندیش، درویش نہیں ہو سکتا۔ خانقاہ کا اِدارہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ کسی کو غم نہیں، کسی کو فکر نہیں۔ میں صرف اُس انسان سے مخاطب ہوں جو اِس وقت باطنی نظام میں فائز ہے۔ وہ قوم میں موجود بے راہ روی کی ذِمہ داری قبول کرتا ہے یا صرف اپنے مرتبے ہی میں مگن ہے؟ ہم اُس سے سوال کرتے ہیں کہ عالی مرتبت! ہم آپ کا انتظار کریں کہ اپنا بیڑہ خود ہی پار کریں۔ خوابیدہ قوت سے بیدار کمزوری بہتر ہے۔

لاخوف کی منزلیں طے کرنے والو! ساری ملّت کو خوف زدہ ہی رکھنا ہے کہ لاتقنطوا کی شرح بھی ہو گی۔ وقت کے غوث، قطب، ابدال، قلندر کیا کر رہے ہیں۔ ہمارے اکابرین ذرا دھیان کریں۔ اے صاحبانِ بصیرت! ہم لوگ راستہ بھول گئے۔ کہاں ہیں رجال الغیب، پکار ہے پکار ہے، فریاد ہے فریاد ہے —کوئی بے بصر مرید میری اِس بے باکی کو گستاخی نہ سمجھے —یہ ہماری اُن کی بات ہے —راز و نیاز کی رمزیں ہیں۔

اور، ہمارے علماء —"فی سبیل اللہ فساد" —لیکن نہیں۔ سب علماء نہیں۔ قابلِ قدر تو قابلِ قدر ہیں۔ علم والے تو علم دے رہے ہیں۔ لاکھوں مساجد کے لاکھوں آئمہ —پانچ وقت تبلیغ کر رہے ہیں اور اِس نااہل قوم کا ذمہ دار کون ہے؟ اب اُس نااہل ڈاکٹر کی طرح یہ نہ کہنا کہ

ہم نے تو اپنا فرض پورا کیا آگے مریض کا مقدّر — قوموں کے لیے ایسے نہیں ہوتا۔ ذِمہ داری لی جاتی ہے۔ صرف فرض پورا نہیں کیا جاتا۔ اگر خدانخواستہ قوم کو کوئی حادثہ پیش آیا تو تم بھی نہ رہو گے — نہ اہل، نہ نااہل — سب ہی ایک کشتی میں سوار ہیں۔ زندگی میں آخرت کا عمل سکھانے والو — زندگی کا عمل کب سکھاؤ گے ؟

ہمارے اور بھی محسن ہیں، ہمارے سیاست دان، لیڈر صاحبان۔ قائدین کی بہتات نے قیادت کا فقدان پیدا کر دیا ہے۔ اِتنے لیڈر کہ قوم اکیلی رہ گئی ہے۔ ہر ناعاقبت اندیش کو زعمِ آگہی ہے۔ ہر چرب زبان سیاست دان ہے۔ ہر آدمی ہر دوسرے آدمی کو ہر وقت کچھ نہ کچھ سمجھا رہا ہے۔ سیاست کے فلسفے بیان ہو رہے ہیں۔ جمہوریت کے فوائد پر لیکچر ہو رہے ہیں۔

کالعدم کو سوئے عدم ہی کیوں نہ رخصت کر دیا جائے؟ آج کی سیاست راستے مانگ رہی ہے۔ بھیک مانگ رہی ہے۔ رحم طلب کیا جا رہا ہے۔ اِلتجا، ہمارا پسندیدہ عمل ہے۔

علم والے، آدھے ملک کو آدھے ملک کے خلاف اُکسا رہے ہیں۔ اِسلام دنیا کو نظام دینے کے لیے آیا اور آج ہمیں لادین اور بے دین نظام کی افادیت بتائی جا رہی ہے۔ نئی معیشت نئی سیاست کی اَساس ہے۔ شکر ہے کہ ابھی سیاسی ڈھانچے بننے باقی ہیں۔ ابھی اتنی جلدی ہی کیا ہے! مارک ٹائم — ہمارا نعرہ ہے۔ اِک عجب عالم ہے، قیامت ہے کہ رات کب کی ختم ہو چکی ہے لیکن سورج ابھی نہیں نکلا — ابھی شاید طویل منصوبہ بندی کا دَور ہے۔ سوال یہ ہے کہ صف بندی کا زمانہ کب آئے گا۔

عزیزانِ محترم! میری مانو تو آپ کسی کو نہ مانو — کسی کی نہ سنو، اپنی مرضی کرتے جاؤ، حتیٰ کہ وہ وقت آن پہنچے جب ساری قوم اللہ کی رحمت کو پکارنے پر مجبور ہو جائے اور پھر افلاک سے نالوں کا جواب آئے گا۔ دُعا کو تاثیر کا منہ دیکھنا نصیب ہو گا۔ ایمان سینوں میں بیدار ہو گا — اور پھر نکلیں گے غاروں سے طاقتور شیر، اللہ والے، باطن کے شہباز، سلطان الفقراء، شہنشاہِ قلندراں — اور پھر آناً فاناً طوفان کے رُخ موڑ دیے جائیں گے، ٹوٹے ہوئے شیشے —

معاف کرنا ٹوٹے ہوئے دِل، جوڑ دیے جائیں گے۔ حق والوں کو حق مل جائے گا، قوم کے روشن مستقبل کا ستارہ طلوع ہو گا، اندیشے دَم توڑ دیں گے اور اُمید کے مسکن جگمگائیں گے — لیکن — کیا کبھی ایسے ہوا —؟ کیا ایسے کبھی ہو گا —؟ کیا ایسے ہو سکتا ہے —؟ اہلِ باطن کی خدمت میں سوال ہے —!

عذاب

عذاب اور عبرت کے الفاظ سننے میں بھی سخت ہیں اور سمجھنے میں بھی۔ عذاب کسے کہتے ہیں؟ —عذاب اُس وقت کا نام ہے جب انسان اپنے اعمال کا نتیجہ اپنے سامنے دیکھے۔ اِنسان کی بداعمالیاں جب ایک خوفناک نتیجہ بن کر اُس کی راہ میں آموجود ہوں، عذاب کا لمحہ ہے۔

فطرت اِنسان کی لغزشوں اور بد اعمالیوں کو اکثر معاف کرتی ہے۔ اِنسان اپنے اعتقادات کا مذاق اُڑاتا ہے۔ وہ سرکشی کرتا ہے، وہ لاف زنی کرتا ہے۔ وہ خود کو خود ساختہ مالک و مختار سمجھتا ہے، وہ اطاعت سے رُوگردانی کرتا ہے اور اگر اطاعت کرے بھی تو اُس کا معاوضہ اِس شکل میں وصول کرتا ہے کہ لوگ اُس کی اطاعت کریں— فطرت خاموش رہتی ہے— سرکشی جاری رہتی ہے اور پھر ایک ایسا لمحہ آتا ہے کہ ظالم کا ہاتھ معصوم کی طرف اُٹھتا ہے— مجبور پر اُٹھتا ہے— مظلوم کی فریاد فطرت کو اِنصاف کے لیے پکارتی ہے، بس فطرت جب اِنصاف کرنے پر آجائے تو سمجھ لیجیے کہ عذاب کا وقت آگیا— کسی اِنسان کے کون سے اعمال کسی اِنصاف کے کیسے منتظر ہو سکتے ہیں— انصاف، بس قیامت ہے، عدالت رحم نہیں کرتی۔ جب رحم نہ رہے تو اعمال کا نتیجہ سوائے عذاب کے اور کیا ہو سکتا ہے! عذاب کے لمحات، محاسبے کے لمحات ہیں، عبرت کی گھڑیاں ہیں— قیامت کا منظر ہے۔

عذاب کا وقت، وہ وقت ہے جب اِنسان سے دُعائیں چھن جائیں— جب اِنسان گُتھیوں کو اپنی عقل سے سلجھانا چاہے اور عقل سے وہ گُتھیاں مزید اُلجھ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ عذاب قریب ہے۔ عقل اور صرف عقل، طاقت اور صرف طاقت مسائل کا حل نہیں دے

سکتے۔ جب تک اُس کا فضل حاصل نہ ہو، ہمارے تمام کام اور ہمارا تمام حاصل ہمارے لیے عذاب لکھ رہے ہیں—ہم خود اپنے لیے اپنے ہاتھوں سے عذاب لکھتے ہیں۔

یتیم کا مال کھانے والا کتنی خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے کہ اُسے کوئی روک نہیں سکتا— مال کا مالک یتیم ہے، محروم ہے، اور غاصب اپنی قوت میں ہے۔ وہ یتیم کا مال ہڑپ کر جاتا ہے، بس یہاں سے ہی عذاب کی اِبتدا ہوتی ہے۔ یتیم کا مال، یتیم کا حق، یتیم کا حصہ پیٹ میں جائے تو ایسے ہے جیسے پیٹ میں آگ—اور عذاب کسے کہتے ہیں—جب اِنسان کا لالچ، اُس کی عقل اُسے آگ نگلنے پر مجبور کر دے۔ عذاب کو ہم خود ہی دعوت دیتے ہیں۔ ہوسِ زر پرستی اِبتدائے عذاب ہے۔

جب اِنسان کے دِل سے اِنسانوں کا اِحترام اُٹھ جائے تو سمجھ لیجیے کہ عذاب کا دَور آ گیا۔ عذاب کے زمانے بد اعتمادی اور بد نظمی کے زمانے ہیں۔ جب اِنسان دوستی، اِنسان دشمنی میں تبدیل ہو جائے تو آغازِ عذاب ہے۔ اِنسان جب اِنسانوں کو خوفزدہ کرے یا اُن سے خوفزدہ رہے تو اور عذاب کیا ہے! تعجب تو یہ ہے کہ ہر اِنسان ہر دوسرے اِنسان کو بُری نگاہ سے دیکھے اور افسوس تو یہ ہے کہ کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہ ہو—ہر طرف قیل و قال ہو اور حال یہ ہو کہ بس بُرا حال ہو—ہر طرف مسیحاؤں کا ہجوم ہو اور مریض دَم توڑ رہا ہو—خدا خوفی نہ رہے تو مخلوق خوفی کی وبا پھیل جاتی ہے—اور عذاب کی اِنتہائی صورت یہ ہے کہ عذاب نازل ہو رہا ہو اور لوگ بدمستیوں اور رنگ رَلیوں میں محو ہوں—پانی سر تک آنے والا ہو اور اِنسان ٹس سے مَس نہ ہو۔

عذاب کے زمانے ہر دَور میں مختلف انداز سے آتے ہیں۔ جب اولاد ماں باپ سے باغی ہو اور ماں باپ اولاد سے بے خبر ہوں تو کسی مزید عذاب کا کیا تذکرہ؟

آج کے اِنسان کے لیے آج کا عذاب ہے—آج کی بداعمالیاں آج کی سزا کی منتظر ہیں—جب اِنسان کے پاس آسائشیں ہوں اور سکون نہ ہو تو عذاب ہے—جب محافظ موجود

ہوں اور حفاظت عنقا ہو تو عذاب ہے —جب نیکی، بدی نظر آئے اور بدی محترم مانی جائے تو عذاب ہے— عذاب کا وقت خدا کسی پر نہ لائے—وہ وقت کہ جب مسلسل سفر ہو رہا ہو اور فاصلے نہ کٹتے ہوں تو عذاب قریب ہوتا ہے۔ ایسا وقت کہ اِنسان پر بغیر قصور اور بغیر کسی جرم کے مصیبتیں نازل ہوں اور وہ فریاد تک نہ کر سکے، عذاب کا وقت ہے۔ عذاب اُس وقت کو بھی کہتے ہیں کہ مبلغ تبلیغ کرے اور سامعین مذاق اُڑائیں۔ جب محسن کُشی وباء کی شکل اختیار کر لے، عذاب ہے۔

عذاب کا لمحہ وہ لمحہ ہے جب کرنیں اپنے سورج کو چاٹنے لگ جائیں، جب شاخیں اپنے درخت کو کھا جائیں، جب اعضا اپنے وجود سے کٹ جانا چاہیں، جب اجزا اَپنے کُل سے منحرف ہوں، جب اپنی صورت اپنی صورت نہ رہے، جب نہ ہونا ہونے سے بہتر ہو، جب آدھا راستہ طے کرنے کے بعد مسافر سوچنے لگ جائیں کہ یہ سفر بے کار ہے۔ عذاب ہی عذاب ہے، اُس مسافر کے لیے جس کے لیے اپنے سفر میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہے— آگے جانے کی خواہش نہ رہے اور لوٹ جانا ناممکن ہو، جب اِنسان اپنے ماضی سے کٹ جائے اور مستقبل واضح نہ ہو، قافلے منتشر ہو جاتے ہیں اور رہنماؤں کی کثرت ہوتی ہے۔ عذاب ہے ایسی مسافرت جس میں سفر کا انجام بھی سفر ہو—جس میں ہم سفر صرف اندیشہ ہو—ایسا سفر جیسے صحرا میں، رات کی تنہائی میں، ایک مسافر جسے اپنی آواز سے ڈر لگتا ہے۔ ہولناک سنّاٹے میں چیخ کی آواز عذاب کا اعلان ہے۔

جب اِنسان اپنے دیس میں خود کو پردیسی محسوس کرے تو عذاب ہے۔ جب اپنے گھر میں اِنسان خود کو مہمان محسوس کرے تو عذاب سے کم نہیں۔ جب آوازوں کا اِتنا شور ہو کہ اِنسان کی گویائی آواز کے سمندر میں ڈوب جائے تو دُکھ کا زمانہ ہے۔ جب سورج روشنی دینا بند کر دے تو عذاب ہے۔ جب زمانہ اَمن کا ہو اور حالات جنگ سے ہوں تو عذاب ہے۔

ظُرفہ عذاب تو یہ ہے کہ دِلوں سے مروّت نکل جائے، اِحساس ختم ہو جائے،

ہمدردی کے جذبات سرد پڑ جائیں اور اِنسان کھو کھلی آنکھوں سے جلتے ہوئے گھر اور ڈُوبتے ہوئے سہارے دیکھ رہا ہو — جب فریاد زبان پر آنے سے پہلے زبان کٹ جائے — جب اِنسان کے پاس راز ہو اور اُس کا کوئی محرمِ راز نہ ہو — جب آنکھوں میں آنسو ہوں اور اُس کے گرد جشن منانے والے درندے ہوں — جب وحشت رقص کرے اور معصومیت کے جنازے اُٹھ رہے ہوں — عذاب ہے۔ میرا رُوئے سخن خدانخواستہ کراچی کی طرف نہیں — قطعاً نہیں، کیونکہ کراچی جس عذاب سے گزرا ہے اُس کے لیے کوئی بیان ممکن نہیں۔ وہاں جو ہُوا نا قابلِ بیان ہے — وہ عذاب تھا، عتاب تھا، قیامت تھی کہ کیا تھا — اِتنے مہذب زمانے میں، اِتنے بڑے شہر میں، اِتنے غیر مہذب واقعات — جس نے سنا اُسے اپنی سماعت عذاب لگی، جس نے دیکھا اُسے اپنی بصارت عذاب نظر آئی۔ ایسے واقعات سننے سے بہتر تھا کہ ہم بہرے ہو جاتے، ایسے واقعات دیکھنے سے بہتر تھا کہ ہم اندھے ہو جاتے۔ اشرف المخلوقات میں درندگی، عذاب کی نوید ہے۔ کس کس نے کیسے کیسے یہ سانحہ لکھا، اِس سے بحث ہمارا کام نہیں — ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ کا تازہ زخم کراچی کا سانحہ ہے۔ اِس سانحہ سے ہزاروں سانحے یاد آسکتے ہیں۔ یہ زخم پرانے زخموں کو ہرا کر سکتا ہے۔ معصوم بچیوں کے ساتھ درندگی، اُن تمام درندگیوں کی اِنتہا ہے جنہیں خاک و خون کے واقعات کہا گیا۔ عذاب یہ نہیں کہ کیا ہوا، عذاب تو یہ ہے کہ اِس واقعے کے پیچھے کیا ہے اور اِس سے آگے کیا ہو گا۔ طوفان گزر جائے تو بھلا، اگر طوفان رُک جائے تو خطرہ موجود ہے۔ آگ بجھ جائے تو اچھا، ورنہ دبی ہوئی آگ زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے — کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ ہے۔ ہم پہلے بھی حادثے سے گزر رہے ہیں — بازو کٹ چکا — اب حادثے کیا چاہتے ہیں ہم سے —؟ کیا ہمیں مایوسی کے حوالے کیا جا چکا ہے کہ ہم پر وبائیں نازل ہیں — کیا ہم پر توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہیں — کیا ہم سے دعائیں چھِن چکی ہیں — کیا ہم بھول گئے ہیں کہ ہمارے دروازوں پر بیرونی خطرات بھی دستک دے رہے ہیں — کیا اندرُونی اِنتشار بھی بیرونی خطرے کا شاخسانہ ہے — کیا کشتی اور کنارے میں ہمیشہ کے لیے

جدائی ہو چکی ہے؟ کیا ہم ایک ظالم قوم ہیں— کیا ہم بے حس ہیں— کیا ہم بے بس ہیں؟ کیا ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے— کیا ہم آنے والی نسلوں کو جوابدہ نہیں ہوں گے— کیا ہم پر کوئی اور یومِ حساب نہ آئے گا— کیا ہمارا حساب، عذاب کے علاوہ کچھ نہیں— کیا ہم نشے میں ہیں؟— غفلت کا نشہ، بے حسی کا نشہ، اپنی خود غرضی کا نشہ—؟ کیا ہم سے ہمارا مستقبل ناراض ہے— کیا ہم سے ہمارا ماضی کٹ چکا ہے؟ کیا ہم ناقابلِ اصلاح ہو چکے ہیں— کیا اُس کی رحمت نے ہمیں چھوڑ دیا ہے؟— ہم کیوں عذاب میں ہیں!!

اے مالک! ہمیں ہمارے اَعمال کی زَد سے بچا— ہمیں ایک دُوسرے کے حوالے نہ کر!— ہمیں اپنی رحمت اور اپنے فضل کے حوالے رکھ!— کیا یہ ممکن نہیں کہ جس قوم سے خطا ہو جائے، اُس پر بھی تیری عطا ہو جائے— ہو تو سکتا ہے! تُو اگر چاہے تو رات سے دن پیدا ہو، مُردہ سے زندہ پیدا ہو، خزاؤں سے بہار پیدا ہو، نفرت سے محبّت پیدا ہو— تُو چاہے تو مدّھم روشن ہو جائے۔ ہمارے مالک! ہم پر اپنی رحمت کے دروازے کھول، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمیں عذاب سے بچا—!!

مصروفیت

ہم سب مصروف ہیں۔ ہمارے پاس فرصت نہیں۔ ہم کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ اچھائی نہ ہو تو بُرائی کرتے ہیں — ہم خاموش اور تنہا ہوں، تو بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں — کبھی یادیں دُہراتے ہیں، کبھی مُستقبل کے خواب دیکھتے ہیں، تصوّرات کے ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں۔ ہم آئینوں میں عکس دیکھنے کے عادی ہیں — حقائق کو دیکھنا اتنا دلچسپ نہیں، جتنا حقائق کا عکس۔

مصروفیت کا یہ عالم ہے کہ کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں — ہمیں اپنے لیے وقت میسر نہیں آتا — ہم مصروف ہیں۔ ہمارے لیے ہماری مصروفیت ہی ہماری خود گریزی، خود فریبی، خود شکنی اور خود فراموشی کا جواز مہیا کرتی ہے۔ ہم ایک کام کرتے ہیں تو دوسرا بھول جاتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت سے مقاصد ہیں — بڑے منصوبے ہیں — طویل پروگرام ہیں۔ کثیر اِرادے ہیں، بے شمار عزائم ہیں۔ بس ہر شے کی کثرت ہے، صرف وقت کی قِلّت ہے۔ زندگی مختصر ہے اور مصروفیات بے اندازہ — ہم کیا کریں —! ہم سوچتے ہیں تو ندامت ہوتی ہے، اِس لیے ہم سوچنے کی بجائے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں —!!

ہم لوگوں سے آشنائی کرتے ہیں، ہر ایک سے دوستی، ہر ایک سے رابطہ، اور نتیجہ یہ کہ ہم سب کو مایوس کرتے ہیں۔ ہم خود بھی مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے رُوبرو نہیں ہوتے — اِس لیے کہ ہم اپنے آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہم نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا۔ اب ہم مشین کا پُرزہ بن چکے ہیں — بس فٹافٹ، کھٹاکھٹ چل رہے ہیں — کیوں اور کہاں؟ یہ معلوم

کرنے کا ہمارے پاس وقت نہیں۔ اِتنا تو معلوم ہے کہ ہم جلدی میں ہیں — ہمیں کس بات کی جلدی ہے، یہ معلوم نہیں۔

ہم صبح گھر سے نکلتے ہیں، خوشی خوشی، جلدی جلدی — ایسے جیسے کوئی مجرم طویل قید سے اچانک رہا ہو جائے۔ ہم دفتروں، کارخانوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں جاتے ہیں — اور کام شروع کر دیتے ہیں، مصروف ہو جاتے ہیں — اور پھر شام کو گھر کی طرف ایسے بھاگتے ہیں جیسے کوئی پیاسا کنویں کی طرف۔ ہم گھر پہنچتے ہی اور قسم کی مصروفیات میں کھو جاتے ہیں — ہم مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ نیند کی آغوش میں سب مصروفیتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

کائنات کا ذرّہ ذرّہ مصروف ہے — چرند، پرند، جمادات، نباتات سب مصروف ہیں اور ہم تو افضل ترین ہیں، ہم کیوں نہ مصروف ہوں؟ ہم مصروف تو رہیں گے — لیکن غور طلب بات صرف یہ ہے کہ ہم اپنی مصروفیات سے کیا حاصل کرتے ہیں —؟

ہم مصروفیت کو کمائی بناتے ہیں اور پھر اِس کمائی کے اِستعمال کے لیے الگ مصروف ہو جاتے ہیں — زندگی مصروفیت میں گزر جاتی ہے اور پھر اچانک اِس حقیقت کا اِنکشاف ہوتا ہے کہ اگر مرنا ہی تھا تو مَر مَر کے جینا کیوں تھا! کتنے ناپ تول کے قدم رکھے تھے، کتنی احتیاط کی تھی، کیسے کیسے جتن کیے تھے — اور فرصت کے چند لمحات نہ ملے، اور جب ملنے لگے تو موت نے مہلت نہ دی۔ پہلے زِندگی مہلت نہیں دیتی اور پھر موت آڑے آجاتی ہے — کیا ہمارا مقدّر صرف مصروف رہنا ہی ہے؟ کیا ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکتے؟ کیا ہمارے پاس اِس خوبصورت کائنات کو دیکھنے کے لیے وقت نہیں ہو گا؟ کیا ہم نکلتے اور ڈُوبتے سورج کے مناظر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟ کیا چاندرات اور چاندنی رات ہمارے لیے نہیں ہیں؟ کیا ہم تاریک مصروفیت کی اَماوَس رات میں بھٹکتے رہیں گے —؟

کیا اِنسان افضل ترین تخلیق نہیں؟ اِنسان پہاڑوں کی خوبصورت چوٹیاں اور وسیع و عریض میدانوں سے کب لطف اندوز ہو گا؟ جب تک اِنسان مصروفیت کے عقوبت خانے

سے آزاد نہ ہو جائے، اُسے زِندگی کا حُسن نظر نہیں آسکتا۔ زندگی شکم پروری ہی تو نہیں، تسکینِ قلب و نظر کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ فطرت کا حُسن فاطرِ کائنات کی منشا کے مطابق دیکھا جائے — آنکھیں عطا کرنے والے نے آنکھوں کے لیے نظاروں کا اہتمام کیا ہے، کانوں کے لیے گلستانِ ہستی میں نغمات کے چشمے بہہ رہے ہیں، غور و فکر کے لیے رازہائے سربستہ منتظر ہیں، رُوح کے لیے مائدۂ تجلّیات بچھا ہے — ہم سمجھتے نہیں — ہم صرف آسائشِ وجود کے لیے مصروف ہیں — ہم گنتے ہیں، حاصل کرتے ہیں اور خرچ کرتے رہتے ہیں۔ ہماری زِندگی اعلیٰ تقاضوں سے محروم ہے۔ ہماری مصروفیت صرف شہرت، مال اور لذّتِ وجود کے لیے ہے — کیا زِندگی کے لیے اور کوئی ضرورت نہیں؟ کیا زِندگی کمانے، کھانے، پہننے اور سونے کے علاوہ کچھ نہیں؟ کیا زِندگی کے نصیب میں فرصت نہیں؟ کیا ہمارے پاس کسی کے آنسو پونچھنے کا بھی وقت نہیں؟ — ہم ہر انسان کو اپنی ضرورت اور اُس کی افادیّت کے حوالے سے جانتے ہیں — کیا اِنسان، اِنسانوں کو صرف اِنسانیت کے حوالے سے کبھی نہیں پہچانے گا؟ کیا ہمارے مرتبے اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ نفرت سے ہی دیکھیں گے؟ — کیا ڈاکٹر مریضوں کی جیب سے باہر نہیں نکل سکیں گے؟ — کیا ہماری مصروفیت ہمیں دُوسروں کے لیے تلوار ہی بنائے رکھے گی؟ — کیا ہم دُوسروں کے لیے کبھی شربت نہیں بنیں گے؟ — کیا ہماری مصروفیت نفرت اور تلخی سے آزاد نہ ہو گی؟ — وہ کون لوگ تھے جو خود پیاس سے مر جاتے تھے اور پانی اپنے دوسرے پیاسے بھائی کو دے جاتے تھے — کیا وہ لوگ تھے بھی یا یہ ہمارا وہم ہے؟ — کیا ہماری مصروفیت کسی بانصیب کاہل کو معاف نہیں کر سکتی؟ کیا کاہل بانصیب ہو سکتا ہے؟ — کیوں نہیں! بانصیب کی اپنی مصروفیات ہیں — دِل کی مصروفیات، نگاہ کی مصروفیات، رُوح کی مصروفیات۔ زِندگی کے راز پانے والے، سُراغِ حیات دریافت کرنے والے، دفاتر، کارخانوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں مصروف نہیں ہوتے — وہ صرف آشنائی کے رمُوز کی گرہ کُشائی میں مصروف ہوتے ہیں — اُن کی نگاہوں میں کچھ اور ہی جلوے ہوتے ہیں — وہ کچھ نہیں کرتے — اُن کے کام — اُن کے

کیا کام! اُن کا صرف ایک کام ہے —ذرّے کے دِل کی دھڑکنیں سننا اور کتابِ ہستی کی وَرق گردانیاں کرنا—وہ خود کسی فنکار کا انوکھا کام ہیں—اُن کا اپنا کیا کام!! وہ خود کسی کے ہیں، اُن کا اپنا کیا پوچھنا! اُن لوگوں کی فرصت، زمانے والوں کی مصروفیت سے ہزار درجے بہتر— یہی لوگ زمانے کا مستقبل ہوتے ہیں— یہ اِنسانوں کے اُفقِ ذہن پر تابناک سورج کی طرح طلوع ہوتے ہیں اور اُن کی بے مصرف مصروفیت کی تِیرہ شبی کی دھجیاں اُڑا دیتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں، افکار کے چہرے سے پردہ اٹھانے والے۔ اِن لوگوں کو فرصت کا راز مل چکا ہے، اِن کے ہاں کوئی مصروفیت نہیں—اور یہ لوگ ہی صحیح مصروفیت کے مفہوم سے آشنا ہیں—!

جو شے چلنے سے حاصل نہیں ہوتی، وہ ٹھہرنے سے حاصل ہو جاتی ہے—جو راز پیسے جمع کرنے میں نہ پایا جائے ،وہ خرچ کرنے میں پایا جائے گا۔ جسے سونے والا دریافت نہ کر سکے، اُسے جاگنے والا ضرور دریافت کر لے گا۔اِنسان کے گرد مصروفیت نے جو جال بُن رکھا ہے، اُسے فرصت توڑ دیتی ہے— مصروفیت، غلامی ہے اور فرصت، آزادی—اِس سے پہلے کہ ہم سے سب کچھ چھن جائے، ہم خود ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے!!

منفعت

منفعت طلبی یا افادیت پرستی، یا سادہ الفاظ میں فائدے کی تمنّا، یا خود غرضی کا سفر بڑا ہی بے رونق اور بے کیف سا سفر ہے۔ اِنسان ہر حال میں اگر یہی سوچتا رہے کہ اُس کا فائدہ کس بات میں ہے، تو وہ اِس کائنات سے کٹ کر رہ جائے گا۔ ہر بات تو اِنسان کی منفعت کے لیے نہیں۔ یہ کائنات دُوسروں کی منفعت کی بھی کائنات ہے۔

اپنا فائدہ سوچنے والا اِنسان دوسروں کو صرف استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ کسی کو کچھ فائدہ پہنچانا نہیں چاہتا اور اِس طرح وہ بے فیض ہو کر رہ جاتا ہے۔ اِنسان دوسروں کے کام نہ آئے، تو اُن سے کام لینا ظلم ہے۔ یہ ظلم دنیا میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے ہاں ہر صاحبِ مقام اور صاحبِ مرتبہ اِنسان اپنے مقام اور اپنے مرتبے کا خراج وصول کرتا ہے — اور کچھ نہیں تو لوگوں سے سلام کی توقع کرتا ہے لیکن خود دوسروں کو سلام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔

معاشرے میں عزت کی تمنّا خود غرضی کی انتہا ہے، اِس طرزِ سلوک کو اِستحصال بھی کہتے ہیں۔ آخر دوسروں میں باعزت ہونے کی تمنّا ہی کیوں ہو۔ لوگوں سے اپنی صداقت اور دیانت کی قیمت کیوں وصول کی جائے۔ لوگوں کو کیوں مجبور کیا جائے کہ وہ آپ کی عزت کریں، آپ کا احترام کریں، آپ کا ذِکر کریں، آپ کی بات کریں۔ لوگ اپنے اپنے کام کیوں نہ کریں۔

ایک آدمی محنت کرتا ہے، نوکر ہو جاتا ہے، افسر بن جاتا ہے۔ اب افسری کر کے ماتحتوں سے خراج وصول کرتا ہے۔ اُن سے توقع کرتا ہے کہ وہ اُس کی عزت کریں، اُس کو سلام کریں۔ اُس کی غیر سرکاری حیثیت کا بھی احترام کریں، جبکہ وہ خود اُن کی زندگی اور زندگی کے تقاضوں سے بے خبر اور لاتعلق ہو۔ شاید لوگ مرتبہ اِس لیے چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ مرتبے کے

آگے سرنگوں ہوں۔ کیا اپنی سربلندی دوسروں کو سرنگوں کرنے سے حاصل ہوتی ہے؟

شاید اِنسان نے فطرت سے یہ مزاج حاصل کیا ہے۔ ایک وسیع کائنات بنانے والے نے اِنسان کے لیے ایک محدود دنیا بنائی اور اِس میں اِنسان کو محدود زندگی دے کر محدود اِستعداد عطا فرمائی۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اب اِس محدود اِنسان پر لازم ہے کہ لامحدود کائنات بنانے والے کو سجدہ کرے، اُس کے کسی فعل پر تنقید نہ کرے، اُس کا گلہ نہ کرے، بس اُس کی تسبیح کرتا جائے۔ اِنسان کی مجبوری یہی ہے کہ وہ اِس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے۔ اِنسان کو جکڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اُس کی تقدیر قوی ہے اور تدبیر کمزور۔ وہ کرے بھی تو کیا کرے۔ بے بسی میں سجدے کے علاوہ اور ہے بھی کیا!

اِنسان سوچتا ہے۔ اُسے سوچنا نہیں چاہیے، لیکن وہ سوچنے پر بھی تو مجبور ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اِتنے بڑے ستارے، اتنے بڑے سیّارے، یہ چاند، یہ سورج، آخر کس کام کے۔ شبِ فرقت یا تنہائی کی رات میں تارے بڑے کام آتے ہیں۔ اُداس اِنسان ستارے گنتا رہتا ہے اور ستارے گنتی میں نہیں آتے۔ آخر اِن ستاروں کا فائدہ کیا ہے؟ اتنے بے شمار ستارے، بیمار انسان کی راتوں کے ساتھی، اُس کی بیماری دُور نہیں کرتے۔ غریب کی غریبی دُور نہیں ہوتی۔ وہ ستارے گنتا ہے اور اُس کی اپنی آنکھوں سے تارے گرتے ہیں، بلکہ انگارے گرتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ اتنا بڑا سورج، روشنی کا سفیر، زندگی کا محرک کتنا منوّر ہے۔ سورج خود روشن ہے لیکن کسی انسان کے، مجبور انسان کے، غریب انسان کے دِیے کو چُلّو بھر تیل تو نہیں دیتا۔ آخر اس کا کیا فائدہ؟

بادل برستے ہیں، گرجتے ہیں، کڑکتے ہیں۔ دبدبہ ہی تو ہے۔ قطرے قطرے کو ترسنے والے ترستے رہتے ہیں۔ بادلوں کا فائدہ کیا ہے! شعراء نے بادلوں سے مضامین لیے ہوں گے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو شعراء کا کیا فائدہ ہے! شعر موزوں کرنے والے زندگی کو موزوں نہیں کر پاتے۔ شعرِ تَر کی صورت دیکھنے والے لقمۂ تَر کی صورت نہیں دیکھ سکتے۔ آخر اِس کا فائدہ ہی کیا ہے؟

پہاڑوں کا سلسلہ وسیع و عریض ہے۔ پہاڑ راستوں کی دیوار بنے ہوتے ہیں، ورنہ ایک ملک دُوسرے ممالک کے ساتھ ہی ملا ہوتا۔ کتنے فائدے ہیں پہاڑوں کے — اِن سے کیا نہیں ملتا۔ اِن پر مفت اُگنے والے درخت ہیں، جن سے لکڑی ملتی ہے۔ پھل دار درخت ہیں۔ اِن سے پھل ملتا ہے اور جو بہت ہی بے مقصد پہاڑ ہیں، اُن سے کرش ملتا ہے۔ لیکن کہاں ملتا ہے؟ لکڑی غریب کے خون سے زیادہ مہنگی ہے۔ پھل بیمار کی قوتِ خرید سے باہر ہے اور رہا کرش، خرید کے دیکھو۔ اتنی عظیم طاقت، پہاڑ — کس کے لیے؟

بنانے والے نے دریا بنائے۔ نہریں، ڈیم اور پانی حاصل ہوا۔ بجلی بیچی گئی اور ایک عام انسان کو کیا ملا؟ بجلی سے کارخانے چلے۔ نہروں سے فصل حاصل ہوئی — کس کے لیے؟ ملک امیر ہو گئے، انسان غریب رہے۔ تقسیم نامنصفانہ رہی۔ دریا خشک ہو جائیں تو سب برابر ہو جائیں۔ طغیانی آئے تو سب برابر، ورنہ کیا فائدہ؟

صرف یہی نہیں، ہر سطح پر، ہر شعبے میں نعمتیں محروم اِنسانوں کے لیے عجب حال پیدا کرتی ہیں، یعنی وہی بُرا حال۔ صاحبانِ تصوّف ہی کو لیں۔ سُوئے اَدب مقصود نہیں۔ عالی مرتبت صاحبانِ کشف و کرامت معتقدین کو کیا دیتے ہیں؟ — احساسِ محرومی!! کسی کے عرفان کا کیا فائدہ؟ کوئی صاحبِ کمال ہو، تو ہُوا کرے۔ ہماری آرزو تو پوری کرے، ورنہ کیا فائدہ؟ ہمارے دُکھ کی دَوا نہ کرے، تو ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — ہمیں کیا فائدہ؟ کسی کی تعریف سے ہمیں کیا ملے گا؟ بہاروں میں اپنی گائے بھوک سے مر جائے تو کیا فائدہ؟

کسی شعبے کو لیں، صاحبِ کمال دوسروں کے دل میں صرف خوف پیدا کرتا ہے۔ وہ تعریف چاہتا ہے، خراج لیتا ہے لیکن دیتا کچھ نہیں۔ ڈراما لکھنے والوں کو مال ملتا ہے۔ دیکھنے والوں کو کیا ملتا ہے! وقت ضائع ہوتا ہے، بجلی خرچ ہوتی ہے اور ذہن خراب ہوتا ہے۔ بچے ٹی وی دیکھتے ہیں اور امتحان میں بُرا حال ہوتا ہے۔ پھر اِس قوم کے نوجوان ایک مسئلہ بن جائیں گے! اس سے کیا فائدہ؟

تعریف کرنا یا تعریف سننے کی تمنّا کرنا دراصل زندگی کے لیے مصیبت ہے۔ جب

تک کوئی کسی کو قابلِ ذکر منفعت نہ پہنچائے، اُس کی کیا تعریف۔ اپنے خیال کی ترقی بے معنی ہے، جب تک دوسروں کے حال کی ترقی نہ ہو۔ ضرورت سے محروم انسان اِس کائنات اور کائنات کے اَنوار اور صاحبانِ کمال کے کمالات کو کیا خراج دے گا۔ یہی عجب بات ہے کہ مؤکل کا مقدمہ عدم توجّہی اور عدم پیروی کی وجہ سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ بیچارہ اپنے وکیل کی عزت بھی کرتا ہے، مال بھی دیتا ہے وکیل کو — اور مجبور و بے بس اپنی حالت پر روتا بھی ہے۔

اساتذہ کرام کا ذکر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اساتذہ تو اساتذہ ہیں۔ علم والے، علم دینے والے، طالب علموں کی زِندگی بنانے والے — اور اگر سچ کہنے پر آ ہی گئے ہیں تو طلبہ کی زندگی سے کھیلنے والے، علم کو مال میں بدلنے والے، کلاس کے اوقات میں گھر کے کام کرنے والے اور کلاس ٹائم کے بعد ٹیوشنوں پر زور دینے والے — شاہینوں کے نشیمنوں میں کرگسوں کے ہجوم۔ اساتذہ سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ اُن کا کیا فائدہ ہے؟ طلبہ کو کیا فائدہ ہوا؟ پاس ہونے والے طلبہ کو داخلہ نہ ملا۔ فیل ہونے والوں کا تو حشر ہی نہ پوچھو۔ آخر اِس تعلیم کا کیا فائدہ؟ آخر کیا فائدہ؟ اُمراء کے نالائق بچے اَمیر ہی رہیں گے۔ صاحبانِ مرتبہ ہی بنیں گے۔ غریبوں کے بچے، لائق بچے، اپنی غریبی کے آس پاس رینگتے ہوئے نظر آئیں گے — بے فائدہ! اَمیر کے بچوں کو پڑھنے کا کیا فائدہ؟ غریب کے بچوں کو بھی پڑھنے کا کیا فائدہ؟ امیر، امیر رہے گا، غریب غریب۔

آخر اِس زندگی کا بھی کیا فائدہ؟ اِنسان پابندِ زمان و مکاں ہی رہے گا، شام کو سوئے گا، رات کو خواب دیکھے گا، دِن گردشوں میں رہے گا — خوشی کے چند ایّام، غم کے لامتناہی سلسلے، اِنسان کیا کرے! بنانے والے سے پوچھنا گستاخی ہے، سُوئے اَدب ہے۔ موت ہی جب زندگی کا انجام ہے تو یہ ساری کوشش کیا ہے؟ زندہ رہنے کے لیے یا مرنے کے لیے؟

لیکن نہیں، ایسا نہیں۔ اِنسان ہی باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ وہی وارثِ کائنات ہے۔ اِنسان صرف صحت مند سوچ سے محروم ہو رہا ہے، ورنہ یہ سب نظام ایک مربوط اور خوبصورت نظام ہے۔ نظاروں سے لطف حاصل کیا جاتا ہے، اُن سے فائدہ نہیں مانگا جاتا۔ سجدوں سے تعلق کا واسطہ ہے، افادیت کا نہیں۔ روشنی، روشنی ہے، نُور ہے — سب کے لیے یکساں!

اِنسان اپنے آپ سے بیزار ہے، ورنہ ہر جا جہانِ دیگر ہے۔ غور کرنے کا حکم ہے۔ غور کیا جائے۔ سوال کرنے کا حکم نہیں۔ سوال تو ہم سے ہو گا۔ ہر شے سے فائدہ مانگنا ہی زندگی کے لطیف اِحساسات سے محرومی کا باعث ہے۔ امیری غریبی، سکھ دُکھ، دُھوپ چھاؤں — زندگی کے ہی نام ہیں۔

زندگی بدلتی رہتی ہے۔ ایّام بدلتے رہتے ہیں۔ ضرورت پوری ہو نہ ہو، زندگی کا لطف ختم نہ ہو۔ شعر، شعر ہے — راحتِ قلب وجاں، دِل کا سرُور ہے — شعر سے فائدہ نہیں حاصل کیا جاتا، اِس سے لطف حاصل کیا جاتا ہے۔ جگمگاتے ستارے، جھلملاتے آنسو اچھے لگتے ہیں۔ اِن کا فائدہ؟ پھر وہی بات!! آخر فائدے کا ہی کیا فائدہ ہے؟ زِندگی سے زِندگی کے علاوہ کیا چاہیے! عبادت سے ماسوائے عبادت نکال دو تو معلوم ہو کہ اصل منفعت کیا ہے۔ زِندگی سے تمنائے منفعت، اندیشہِ زیاں نکال کے زِندگی کا لطف لے کر دیکھو۔ کبھی تو دُکان دار بننا چھوڑو۔ ہر کام سے فائدے تلاش کرنا — یہ کیا تلاش ہے! اپنے وجود میں نُوری وجود تلاش کرو۔ اِس کائنات میں اپنی کائنات دریافت کرو۔ لذّتِ وجود ہی تو زندگی نہیں۔ رُوح کی خوراک کیا ہے؟ اسے تلاش کرو۔ اپنے باطن کا سفر کرو۔ اپنی گٹھڑی کی گرہ کھولو۔ اپنے دِل کی دُنیا کی سیر کرو۔ گلاب کے رنگ اور اُس کی خوشبو نے بُلبُل کو ترنّم بخشا۔ آپ گلاب سے گل قند بناتے ہو۔ آپ کیا کرتے ہو؟ رنگوں سے بے بہرہ، نغمات سے محروم، عقل کے اندھے، خوشیوں سے مال مانگتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟ بنانے والے نے جو بنایا، وہی اصل ہے۔ دینے والے نے جو دیا، وہی اصلی ہے۔ کرنے والے نے جو کیا، وہی حسنِ تخلیق ہے — فائدے کا سفر بے فائدہ ہے!

تعریف

تعریف سننے کی تمنّا اِنسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے، لیکن اِس کمزوری کے اندر بعض اوقات اِنسان کی طاقت پنہاں ہوتی ہے۔ تعریف سننے کی آرزو میں اِنسان کے اندر کا خوابیدہ فنکار بیدار ہوتا ہے۔ فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔ فن کی بقا تعریف کے دَم سے ہے۔ تعریف نہ ہو تو فن افسردہ ہو جاتا ہے۔

اِنسان کی صفات تعریف کی متقاضی ہیں۔ تعریف، خوشامد نہیں۔ خوشامد، بغیر صفت کے تعریف ہے۔ خوشامد اُس بیان کو کہتے ہیں جس کے دینے والا جانتا ہے کہ جھوٹ ہے اور سننے والا سمجھتا ہے کہ سچ ہے۔ خوشامد سننے کا طالب مریض ہے اور خوشامدی اِس مرض میں اضافہ کرتا ہے۔

بادشاہوں کو ظلِّ سبحانی کہلانے کا شوق دربار کو خوشامدیوں کی آماجگاہ بنا دیتا ہے اور یہ درباری بادشاہوں کی آنکھوں پر خوشامد کی خوبصورت پٹیاں باندھ کر اُنہیں اُن کی اصلیّت سے بے خبر رکھتے ہیں۔ ملکی معاملات کی اِصلاح کی بجائے شہنشاہ اپنے قصیدے سنتے ہیں اور رعایا کو مرثیہ خوانوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

تعریف نہ ہو تو شاید دُنیا میں اِتنا ہنگامہ نہ ہو۔ لوگ جائز ناجائز دولت کما کر گھروں کو سجاتے ہیں، ان میں قمقمے لگاتے ہیں، روشنیاں کرتے ہیں اور پھر دوستوں کو دعوت دیتے ہیں۔ تعریف ہوتی ہے اور پھر ہوتی ہی رہتی ہے۔ گھروں میں چراغاں رہتا ہے اور دِل اندر سے بجھتے جاتے ہیں۔ مال کی تعریف، مال کی نمائش کی تعریف اِنسانوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ جس اِنسان میں ذاتی

صفات نہ ہوں، وہ اپنے لباس سے لے کر اپنے مکان تک اپنی ہر شے کی تعریف چاہتا ہے۔

تعریف کی تمنّا اِنسان کو بڑے کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وطن میں تعریف سننے کی تمنّا میں اِنسان پر دیس تک پہنچ جاتا ہے۔ مال کماتا ہے۔ پر دیس کی اَذیّت برداشت کرتا ہے۔ اُس کے گھر والے دولت کا اظہار کرتے ہیں، تعریف سنتے ہیں، اور وہ پر دیس میں تنہائی کی بھٹی میں جلتا ہے۔ سال میں ایک آدھ دفعہ وطن واپس آتا ہے۔ دوستوں کو جمع کرتا ہے۔ مال خرچ کرتا ہے۔ تعریف سنتا ہے اور پھر آزردہ خاطر پر دیس کی اجنبیت کے حوالے ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات تعریف کی آرزو میں اِنسان جان پر بھی کھیل جاتا ہے۔ وہ اپنی موت کو قابلِ تعریف بنانے میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تعریف کا زخم سب سے گہرا زخم ہے۔ اس کا مندمل ہونا مشکل ہے۔ تعریف سننے کی بیماری میں مبتلا اِنسان کی اگر تعریف نہ کی جائے تو وہ اِسے اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اگر آپ کا دوست نیا لباس زیبِ تن کر کے آپ کے پاس آئے اور آپ کسی وجہ سے اُس کے لباس کی طرف توجہ نہ کریں تو آپ کی دوستی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

اِنسان کی تمام تراش خراش، بن سنور، سج دھج، اُس کا بانکپن، اُس کا دَم خم، اُس کا لب و لہجہ، اُس کے ناز و ادا، اُس کی حرکات و سکنات تعریف طلبی کے حربے ہیں۔ ایک پہلے سے مقروض انسان نیا قرضہ لے کر اپنے بیٹے کا ولیمہ فائیو سٹار ہوٹل میں صرف اِس لیے کرتا ہے کہ اُس کی تعریف ہو— تعریف کرنے والے تعریف کرتے ہیں، لیکن دِل ہی دِل میں اُس کی کوتاہ اندیشیوں کے تذکرے کرتے ہیں۔ اُس کے قرض خواہ اُس کی کیا تعریف کرتے ہوں گے!

اگر اِنسان کی شکل بہتر ہے تو اِس میں اُس کا اپنا کیا کمال ہے— اِنسان میں اِنسان کا اپنا کیا ہے؟

اَمیر آدمی کی تعریف، غریب کو اُس کے حق سے محروم رکھنے کا جواز ہے۔ اگر ہم دولت مندوں کی آرائشوں کی تعریف کرنا چھوڑ دیں، تو شاید دُنیا میں ظلم کم ہو جائے۔ حق والوں کو حق سے محروم کر کے ظالم اپنی دولت کی تعریف سنتا ہے اور یوں معاشی ناہمواریاں

قائم رہتی ہیں۔ ظالم اپنے ظلم کو فن کے طور پر ظاہر کرتا ہے اور تعریف کرنے والے اُسے داد دیتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو تعریف کی داستان میں ظلم کی داستان پنہاں ہے۔ بڑی بڑی سلطنتیں، بڑے بڑے ممالک، ترقی یافتہ ممالک قابلِ تعریف کارنامے سرانجام دیتے ہیں لیکن اُن کے پیچھے وہ مظالم مخفی ہوتے ہیں جو وہ اِنسان پر رَوا رکھتے ہیں۔ آج آدھی دُنیا کرب میں مبتلا ہے اور باقی کی دُنیا قابلِ تعریف ٹھہرائی جارہی ہے۔

سائنس نے بڑے بڑے قابلِ تعریف کارنامے انجام دیے—بس کائنات کی تسخیر کا سہرا سائنس کے سر ہے اور ایٹم بم کی تباہ کاریاں بھی اِس تعریف کے پردے میں موجود ہیں۔ زندگی کو آسانیاں عطا کرنے کا دعویٰ رکھنے والی تہذیبیں زندگی کو عذاب میں مبتلا کررہی ہیں۔ آج کے اِنسان کو آسائشیں عطا کردی گئی ہیں۔ بیماروں کے لیے ہسپتال قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ زِندگی کی حفاظت کا دعویٰ کرکے تعریف سننے والے زِندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا اہتمام کررہے ہیں۔ اَمن کے پجاری جنگ کی تیاری کررہے ہیں۔ تعریف کی لائی ہوئی تباہی اپنی قباحتوں کا مظاہرہ کرنے والی ہے۔ اگر تعریف کرنے والے کا مزاج بدل جائے تو تعریف سننے والے کا مزاج ضرور بدل جائے گا۔

تعریف سننے والے اِنسان کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں، جب تک تعریف کرنے والے کی اِصلاح نہ ہو۔ بہرحال تعریف حد سے نہیں بڑھنی چاہیے۔ تعریف کے باب میں سب سے زیادہ خطرناک وہ مقام ہے، جب کوئی کم ظرف اپنی زبان سے اپنی تعریف کررہا ہو۔ یہ عذاب ہے۔ کوئی آئینہ اُسے اِس عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ تعریف جہاں انعام ہے، وہاں سزا بھی ہے۔ تعریف صفت ساز بھی ہے اور صفت شکن بھی—لیکن اپنے منہ سے اپنی تعریف، اپنی اِنسانیّت کی تذلیل ہے۔

خاموشی

خاموش اِنسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں—خاموشی خود ایک راز ہے اور ہر صاحبِ اَسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زیور ہے اور احمق کا بھرم۔ خاموشی میں عافیت ہے۔ اگر ہم زبان کی پھیلائی ہوئی مصیبتوں کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ خاموشی میں کتنی راحت ہے۔ زیادہ بولنے والا اِنسان مجبور ہو جاتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کو ملا کر بولے۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ سوچ سکے کہ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا۔

فطرت کے عظیم شہکار ایک مستقل اور مسلسل سکوت میں ہیں۔ پہاڑوں کے عظیم و وسیع سلسلے خاموش ہیں۔ اِس خاموشی میں کتنی داستانیں پنہاں ہیں۔ اِس سکوت میں کتنی ہیبت ہے۔ اِس سنّاٹے میں کتنے راز ہیں۔ پہاڑ اپنے پہلو میں کتنے گنجینے رکھتے ہیں، کوئی کیا جانے، کوئی کیا سمجھے۔ پہاڑوں کے اندر خزانے ہیں، پہاڑوں کے اوپر خزانے ہیں۔ پہاڑوں کے پتھر بھی عجب راز ہیں—سب خاموش، سب ساکت۔ کبھی کبھی اِس مہیب سنّاٹے میں ہوائیں چیختی ہیں۔ ہوا کی آواز پہاڑوں کی خاموشی کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔

پہاڑوں سے گرنے والی آبشاریں اور اُن کی آواز خاموشی کو زیادہ معنی خیز بنا دیتی ہے۔ خاموشی کا اَثر اُس وقت گہرا ہو جاتا ہے، جب چھوٹی سی آواز گونج پیدا کرے۔ پہاڑوں میں جب آوازیں گونجتی ہیں، سنّاٹے مزید مہیب ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں کی خاموشی فطرت کی خاموشی ہے۔ اہلِ دِل حضرات پہاڑوں میں اپنا مسکن بناتے ہیں تو اِس میں یہی راز ہے کہ وہ فطرت کے قریب ہونا چاہتے ہیں اور فطرت بالعموم خاموشی اختیار کرتی ہے۔

ہماری زِندگی کا بیشتر حصّہ خاموشی میں گزرتا ہے۔ دِن ہنگاموں اور آوازوں کی نذر ہوتا ہے اور رات خاموشی کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ محنت سے تھکے ہوئے اِنسان خاموش ہو جاتے ہیں— پرند، چرند، سب خاموش۔ گرمیٔ بازار ختم ہو جاتی ہے اور بند دُکانیں یوں نظر آتی ہیں جیسے بے ربط آوازوں کے لبوں پر تالے پڑے ہوں۔ آواز اِنسان کو دُوسروں سے متعلق کرتی ہے اور خاموشی اِنسان کو اپنے آپ سے متعارف کرتی ہے۔ دُوسروں کو قائل کرنے کی کوششیں آواز کے کرشمے ہیں۔ خود کو مطمئن کرنا خاموشی کا اعجاز ہے۔ زِندگی ایک ایسا راز ہے جو اپنے جاننے والوں کو بھی راز بنا دیتا ہے۔ زِندگی کا دریا خاموشی سے رَواں دَواں ہے۔ اِس میں آوازوں کی موجودگی اِس کی خاموشی کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ زِندگی سراپا اور سربستہ راز ہے اور راز ہمیشہ خاموش ہوتا ہے۔ اگر خاموش نہ ہو تو راز نہیں رہتا۔ کہتے ہیں ایک شخص زِندگی کے راز کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اُس نے بہت سے لوگوں سے رازِ ہستی دریافت کیا۔ کسی نے کچھ نہ بتایا۔ وہ بہت گھبرایا، بہت پریشان ہُوا، چیخا چلّایا۔ آخر کار وہ کچھ مایوس سا ہو کر خاموش ہو گیا۔ ایک خاموش رات اُسے اپنے اندر سے آواز آئی: ”نادان! لوگوں کے دَروازے کھٹکھٹانے سے رازِ ہستی کیا ملے گا۔ تُو نے اپنے دِل کے دروازے پر بھی دستک دی ہوتی“۔ اُس نے اپنے اندر سے آنے والی آواز کو سنا، سوچا، غور کیا۔ اُسے معلوم ہوا۔ جو معلوم ہوا، سو ہوا— اور وہ خاموش ہو گیا۔

یہ راز عجب راز ہے— اِنسان کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے— راز کی تلاش کسی بیرونی سفر کا نام نہیں۔ یہ راز اندر کا سفر ہے۔ اندر کے اِنسان سے راز ملتا ہے اور خاموشی میں ملتا ہے اور ملنے کے بعد خاموش کر دیتا ہے— ایسی خاموشی جس پر گویائی نثار ہو۔ انسان کا اصل ساتھی، اصل رہبر اُس کا اپنا ذوق ہے۔ اُس کی اصل منزل اُس کا اپنا آپ ہے۔ اپنے من میں ڈوبنے کی دیر ہے، گوہرِ مُراد مل جاتا ہے۔ آواز حجاب ہے، خاموشی کا شفِ راز ہے۔ باطن کا سفر، اندرون بینی کا سفر، من کی دُنیا کا سفر، دِل کی گہرائیوں کا سفر، رازِ ہستی کا سفر، دِیدہ وَری کا

سفر، چشمِ بینا کا سفر، حق بینی و حق یابی کا سفر — خاموشی کا سفر ہے۔

علمُ البیان کے خلاف بات نہیں ہو رہی۔ جب راز دریافت کرنا ہو تو خاموشی ضروری ہے۔ اِس کے بعد اُس کا اپنا حکم ہے کہ اِنسان کو بولنے دے یا خاموش کر دے۔ ویسے اِنسان کی عافیت کے لیے خاموشی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔ فطرت کے کرشمے خاموشی سے جلوہ آراء ہیں — سورج ہی کو لیں، اُس نے کبھی اپنی روشنی کے ثبوت میں کچھ دلائل نہیں دیے، بلکہ آفتاب خود ہی دلیلِ آفتاب ہے۔ وہ خاموشی سے دُنیا کو روشنی دیتا ہے۔ کسی سے شکریے کے دو لفظ سننے کا بھی اِنتظار نہیں کرتا۔ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ سورج کا مذہب ہی روشنی ہے اور روشنی خاموش رہتی ہے۔ اِحسان ہمیشہ خاموش رہتا ہے۔ جتایا ہوا اِحسان ضائع ہو جاتا ہے۔ چاند خاموش ہے — کتنا خوبصورت، کتنا منوّر، کیسا روشن، کیسا راز، کیا کیا کرشمے ہیں۔ خاموشی میں کروڑوں ستارے ہیں — اپنی اپنی منزل پر گامزن — کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، کوئی تقریریں نہیں۔ ستارے بڑے پُراَسرار ہیں، چل رہے ہیں، اپنے اپنے مقرر شدہ مدار میں رَواں دَواں — خاموشی اور اِطمینان کے ساتھ۔ فطرت کے مناظر، فطرت کے جلوے، کرشمے — فطرت کی زبان — خاموشی کی زبان ہے۔

اِک تماشا ہے۔ سارا عالم تماشائی ہے۔ آسمان پر کرشمے ہیں۔ زمین پر جلوے ہیں۔ سب خاموش ہیں۔ صحرا کی وسعتیں — عظیم وسعتیں — خاموش ہیں۔ کتنا گہرا راز ہے۔ دُور تک پھیلے ہوئے صحرا، پیاسے صحرا، لب خشک ہیں لیکن لب بند ہیں — عجب داستانیں ہیں۔ اہلِ دل حضرات صحرا کی یاد اور صحرا کی پیاس کے معنی جانتے ہیں۔ دشتِ وحشت اور دشتِ جنوں خاموش ہیں — مکمل سکوت — ! سمندر خاموش ہے۔ گہرا ہے، بہت گہرا۔ خاموش ہے، بہت خاموش۔ بڑا راز، بڑا خاموش۔ سمندر میں طوفان ہیں، لہروں کا اِرتعاش ہے۔ بجا، لیکن سمندر خاموش ہے — بہت خاموش!

خالق کی بات ہم اِس لیے نہیں کر سکتے کہ وہ خالق ہے — اُس کے بارے میں کچھ کہنا

مشکل ہے۔ وہ بولتا ہے اپنے محبوبوں سے، اپنے پیغمبروں سے —اور یہ بولنا—عجب ہے۔ دنیا والوں کے لیے، دُنیا کے بنانے والا خاموش ہے اور اِس خاموشی کے باوجود اُس کے تذکرے ہیں، اُس کی باتیں ہیں، اُس کے چرچے ہیں، اُس کی پسند اور ناپسند کے بیانات ہیں۔ وہ خاموش ہے۔ وہ سب سے بڑا جلوہ ہے، سب سے بڑا راز ہے—اور سب سے زیادہ خاموش۔ اُسے مانو تو خاموش، نہ مانو تو خاموش۔ اُس کی عبادت کرو تو بھی خاموش۔ اُس سے بغاوت کرو تو بھی خاموش۔ خاموشی کو پیدا کرنے والا خود خاموش ہے۔ فرشتے خاموش ہیں، جنّات خاموش ہیں۔

لیکن، اِنسان بولتا ہے اور مسلسل بولتا ہے۔ سچ نہ بول سکے تو جھوٹ بولتا ہے۔ ابہام بولتا ہے۔ اپنی ستائش میں بولتا ہے۔ فطرت کے خلاف بولتا ہے۔ خالق کا گلہ کرتا ہے۔ زِندگی کے کرب کی باتیں کرتا ہے۔ ہنگامے بولتا ہے۔ شاہی فرمان بولتا ہے۔ بغاوتیں بولتا ہے۔ کبھی بندہ ہو کر بولتا ہے، کبھی مولا ہو کر بولتا ہے۔ تنہائیوں میں بولتا ہے۔ کوئی سننے والا نہ ہو تو اپنے آپ سے بولتا ہے۔ خود سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب بولتا ہے۔ خود ہی ثواب بولتا ہے اور خود ہی عذاب بولتا ہے۔ کبھی ماضی بولتا ہے، کبھی مستقبل۔ اِنسان دانائی بولتا ہے، حماقت بولتا ہے۔ خاموش نہیں ہوتا، اِس لیے کہ خاموشی میں اُسے اپنے رُوبرو ہونا پڑتا ہے اور وہ اپنے رُوبرو نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا، لیکن یہ بات وہ کس طرح تسلیم کرے۔ وہ کیسے کہہ دے کہ وہ بیوقوف ہے، وہ ناآشنا ہے، وہ کچھ نہیں ہے۔ اُس کی ہستی، کیا ہستی ہے۔ اُس کی بات، کیا بات ہے۔ وہ اپنی لاعلمی کا علم رکھتا ہے اور پھر بھی خاموش نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جہالت سے آگاہ ہے اور پھر بھی خاموش نہیں ہوتا۔ اُسے خبر ہے کہ قبل اَز پیدائش خاموشی کے زمانے ہیں اور مابعد خاموشی ہے۔ اِس زندگی میں بھی خاموشی ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے، لیکن خاموش ہونا اُس کے بس میں نہیں۔ اُسے غم ملے، تو زمانے کو سناتا ہے۔ اُسے خاموشی ملے، تو دنیا کو بتاتا ہے۔ اُسے بولنے اور صرف بولنے کا شوق ہے اور اُس کے لیے خاموشی اور صرف خاموشی ضروری ہے۔ اِنسان کو بولنے کا اِس قدر شوق ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر آدمی دُوسرے آدمی سے ہر

وقت کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہوتا ہے۔ الفاظ کے وسیع پھیلاؤ میں معانی مفقود ہوں تو بھی اِنسان بولے جاتا ہے اور بولتے بولتے وہ دِن قریب آ جاتا ہے جب اِنسان کو محسوس ہوتا ہے کہ اُس نے صرف جھوٹ بولا۔ اُس نے بے معنی الفاظ بولے۔ اُس نے بے وجہ آواز استعمال کی۔ اُس نے اپنے اصل ساتھی سے کوئی بات نہ کی، کوئی بات نہ پوچھی— یہ ساتھی اُس کا باطن ہے— خاموش ساتھی خاموشی سے ملتا ہے۔ کاش! ہم کبھی خاموشی کے ساتھ اپنے رُوبرو ہوتے!!

پریشانی

اِنسان پریشانی سے دوچار نہ بھی ہو تو بھی وہ پریشانی سے آشنا ضرور ہوتا ہے۔ پریشانی اِنسان کو زِندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور مل جاتی ہے اور پھر اُس کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اپنے حالات سے ہی پریشانی پیدا ہوتی ہے، اِنسان اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے جب پریشان ہوتا ہے تو حالت بہتر بنانے کی صلاحیت سَلب ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ اور ہر طبقہ پریشان ہے۔ امیر پریشان ہے کہ نہ جانے کب دولت ہاتھ سے نِکل جائے۔ غریب پریشان ہے کہ نہ جانے اب زِندگی کیسے گزرے گی۔ نیک انسان اِس لیے پریشان ہے کہ اُسے بُرے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ نیک زندگی گزارنے کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ نیک اِنسان رِشوت دینا نہیں چاہتا اور رِشوت بغیر اُس کے کام نہیں ہوسکتے۔ بس پریشانی ہی پریشانی ہے۔ والدین اولاد کے ہاتھوں پریشان ہیں اور اولاد والدین سے نالاں ہے۔ بچے والدین کا کہنا نہیں مانتے اور والدین بچوں کا کہنا نہیں مانتے۔ دونوں فریق ایک دوسرے کو سمجھاتے ہیں اور ایک دوسرے سے پریشان ہیں۔ افسر ماتحتوں سے پریشان ہیں۔ ماتحت گستاخ ہیں اور ماتحتوں کو گلہ ہے کہ افسر نااہل ہیں۔ اپنے لیے کچھ اور پسند کرتے ہیں اور ماتحتوں کے لیے کچھ اور۔ حکومت سیاستدانوں سے پریشان ہے اور سیاستدان حکومت سے پریشان ہیں۔ جلسے ہی جلسے ہیں اور پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں، دعوے ہی دعوے ہیں، بیانات ہی بیانات ہیں، تقریریں ہی تقریریں ہیں، وعدے ہی وعدے ہیں اور پریشانی بڑھتی جارہی ہے۔ جلسوں پر کتنا خرچ ہوتا ہے — خرچ کی کیا بات! خرچ بغیر تو اِنسان کو قبر بھی نصیب نہیں ہوتی۔

لوگوں کے مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ زندگی مشکل ہوتی جا رہی ہے اور پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ مریض ڈاکٹروں کے رویے سے پریشان ہیں۔ مریض سے محبّت کرنے کا زمانہ گزر گیا اب تو مریض کے حال پر نظر کرنے کی بجائے مریض کے مال پر نظر ہوتی ہے۔ پریشانی ہی پریشانی ہے۔ مریض ہونا غریب ہونے کی ابتدا ہے۔ غیر قانونی ہڑتالوں سے ہسپتالوں میں پریشانی کا جو عالَم ہوتا ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اُستاد شاگرد کا مقدّس رِشتہ بھی پریشان ہو کر رہ گیا ہے۔ کالج کے طلباء اپنے اساتذہ کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں، بس خدا کی پناہ — کسی زمانے میں طلباء اساتذہ سے ڈرتے تھے اور آج اساتذہ طلباء سے ڈرتے ہیں۔ اُستاد پریشان ہیں، طالبِ علم کہنا ہی نہیں مانتے! اُستاد طلباء کو ایسی سزا دیتے ہیں کہ خدا کی پناہ — بڑے بڑے کالجوں کا نتیجہ خوفناک حد تک کمزور رہتا ہے۔ طلباء فیل ہو جاتے ہیں اور یوں ایک مستقل پریشانی میں داخل کر دیے جاتے ہیں۔ طلباء کلاس رُوم میں پریشان رہتے ہیں۔ کمرۂ اِمتحان میں بھی پریشان ہوتے ہیں، سڑکوں پر آ جاتے ہیں اور پھر ایک نئی قسم کی پریشانی ہوتی ہے۔ اللہ رحم فرمائے، آج کے طلبہ پر، آج کے اساتذہ پر — آج کی تعلیم پر!

ہر شعبۂ حیات اپنے اپنے انداز سے پریشان ہے۔ ہر شخص اپنے ماحول میں پریشان ہے، یوں لگتا ہے کہ ہر ستارہ اپنے اپنے مدار میں سرگرداں بھی ہے اور پریشان بھی!

پریشانی حالات سے نہیں، خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان اپنے موجود لمحے سے گریزاں ہو گا، وہ پریشان ہو گا۔ اِنسان آنے والے حالات سے خوفزدہ ہو کر جانے والے حالات کو پریشان کر دیتا ہے۔ اگر گزرے ہُوئے زمانے خوشی کے زمانے ہوں تو بھی اُن کی یاد باعثِ پریشانی ہے کہ اب وہ دِن کہاں گئے، خوشی کے دِن گزر گئے۔ جوانی اور صحت کے ایّام، محبّت و وارفتگی کے دِن ہَوا ہو گئے۔ پریشانی تو یہ ہے کہ خوشیاں ختم ہو گئیں۔ وہ دِن بھی کیا دِن تھے، وہ زمانے بھی کیا زمانے تھے، وہ دَرد بھی کیا دَرد تھا، ساتھی کتنے وفادار تھے، اب بس یاد ہی یاد ہے — پریشانی ہی پریشانی!

اگر ماضی کسی غم سے عبارت ہو تو بھی باعثِ پریشانی ہے۔ غم کی یاد ایک تازہ غم دے جاتی ہے۔ عجب حال ہے، خوشی کی یاد بھی پریشان اور غم کی یاد بھی پریشان۔

اِسی طرح مستقبل اگر اُمّید سے عبارت ہو تو بھی حال پریشان ہے کہ کب وہ سُہانا دَور آئے گا۔ اگر خطرے کا اندیشہ ہو تو بھی حال پریشان ہے کہ اِنسان دُور سے نظر آنے والے خطرے کو ہمیشہ قریب ہی سے محسوس کرتا ہے۔ زِندگی کے نصیب میں پریشانی لکھ دی گئی ہے۔ کبھی اپنے لیے پریشانی ہے، کبھی دوسروں کے لیے پریشانی ہے، کبھی اِس زِندگی کا فکر ہے، کبھی موت کے بعد کا منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے۔ پریشانی ہر حال میں رہتی ہے۔ پریشانی اِنسان کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اِس کا علاج اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک زِندگی دینے والے سے نہ پوچھا جائے۔ جس ادارے نے جو مشین بنائی ہو، وہی اُس مشین کی حفاظت، اُس کے اِستعمال اور اُس کی اِصلاح کا عمل جانتا ہے۔

اگر زندگی ہمارے اپنے عمل کا نام ہے تو اِس کے اندر پیدا ہونے والے بگاڑ اور فساد کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ اگر ہم اپنا علاج ہی نہ کر سکیں تو ہمیں اپنے اِختیارات کی حقیقت معلوم ہو جانا چاہیے۔ اگر زندگی اپنے پیدا کرنے والے ہی کو نہ مانے تو اِسے پریشانی سے کون بچائے۔ ہم اپنے آپ پر اپنی ہمت سے زیادہ بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ ہم خود ہی اپنی پریشانیوں کے مصنّف ہیں اور خود ہی اپنی پریشانیوں سے تنگ ہیں۔ ہم متضاد خواہشات رکھتے ہیں۔ ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دوسری دَم توڑ دیتی ہے۔ اگر دولت اکٹھی کی جائے تو رزقِ حلال کا تصوّر پریشان کرتا ہے اور اگر رزقِ حلال ہی پر قناعت کی جائے تو تلخیٔ حالات پر رونا آتا ہے۔ پریشانی بہر صورت رہتی ہے۔ وطن سے باہر رہنے والوں کو وطن کی یاد پریشان کرتی ہے۔ وطن میں رہنے والوں کو باہر جانے کی تمنّا پریشان رکھتی ہے۔ ہر اِنسان کو اپنے علاوہ کچھ بننے کی آرزو ہے اور یہی آرزو وجۂ پریشانی ہے۔

ہم اپنے علاوہ کچھ نہیں بن سکتے — یہ حقیقت ہی زندگی کا ضابطہ ہے۔ اِسی سے زندگی

کے شعبے اور پیشے قائم ہیں،اِسی سے نظامِ ہستی قائم ہے۔ ہمیں ہماری حدود میں قائم رکھنے والی قوّت پریشان تو کرتی ہے لیکن یہی قوّت زندگی کا راز ہے۔ ہر اِنسان حکمران بننا چاہتا ہے، اگر یہ خواہش پوری ہو جائے تو کون کس کا حکمران ہو گا؟— عجیب پریشانی ہو جائے گی۔ کوئی اِنسان غریب نہیں رہنا چاہتا—اگر سب ہی اَمیر ہو جائیں تو کیا ہو گا؟ اگر دُنیا کی دولت برابر تقسیم کر دی جائے تو چہرے کیسے برابر ہوں گے؟ عقل کیسے برابر ہو گی؟ دِل کیسے برابر ہوں گے؟ دِلبر کیسے برابر ہوں گے؟ ایک نئی قسم کی غیر مساوی تقسیم کا شعور پیدا ہو جائے گا۔ اِنسان علاج میں ترقی کرتا ہے۔ نئے نئے علاج دریافت ہوتے ہیں اور پھر ایک نئی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی بیماری ضرور مہلک اور لاعلاج رہے گی۔ اگر علاج سائنس بن جائے تو دُعا کا مقام کیا ہو گا؟

پریشانی اِنسان کو اِحساس دِلاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی پر اِختیار نہیں رکھتا۔ اگر اِنسان اِس اِحساس پر یقین اور ایمان اُستوار کر لے تو وہ پریشانی سے بچ سکتا ہے، نہیں تو نہیں—!

اگر اِنسان تسلیم کر لے کہ اُس کی زِندگی اور زِندگی کے ساتھ ہونے والے واقعات اور زِندگی کا انجام، خالق کے حکم سے ہے تو یہ پریشانی ختم ہو سکتی ہے۔ گناہ اور بُرائی کی بات نہیں ہو رہی، زِندگی کی بات ہو رہی ہے۔ گناہ اور بُرائی توبہ سے ختم ہو سکتے ہیں۔ توبہ کا مطلب واضح ہے، خالق کو گواہ بنا کے یہ اعلان کرنا کہ آئندہ ایسا عمل سرزد نہ ہو گا—!

بہر حال پریشانی سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اِنسان اپنی زندگی کو خالق کی مرضی کے مطابق بسر کرے۔ جو شخص آج کے دِن، آج کے لمحے پر راضی ہو گیا وہ پریشانی سے نکل گیا۔ زِندگی سے اگر گلہ اور شکایت نکال دی جائے تو پریشانی ختم ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ کو پسند اور دوسروں کو ناپسند کرنا چھوڑ دیا جائے تو پریشانی نہیں رہتی۔ اِس دُنیا میں ہمیشہ رہنے کی آرزو نہ رہے تو پریشانی نہ رہے گی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر زندگی کا انجام موت ہے تو پریشانی کیسی! دُنیا میں کوئی ایسی رات نہیں آئی جس پر دِن نہ طلوع ہوا ہو۔ کوئی ایسا دِن نہیں آیا جس پر رات نازل نہ ہوئی ہو، کوئی ایسا غم نہیں آیا جو کٹ نہ جائے، کوئی ایسی خوشی نہیں آئی جو ہٹ نہ جائے،

کوئی ایسا اِنسان نہیں آیا جو ایک مقررہ وقت کے بعد واپس نہ بلا لیا گیا ہو۔ اِنسان پر کوئی ایسا سفر مُسلّط نہیں کیا گیا جس کی منزل نہ ہو۔

گردشِ شام و سحر اِنسان کو مسرّت، صحت، دولت اور محبّت عطا کرتی ہے اور یہی گردش اپنی عطا کو واپس لے لیتی ہے اور یوں اِنسان اپنے آپ سے محروم ہو جاتا ہے، وہ پریشان ہوتا ہے، حالانکہ اِس میں پریشانی کی بات نہیں۔ اِنسان خود ہی کسی اور طاقت کا عمل ہے۔ اُس طاقت نے اِنسان کو اِس دُنیا کے سفر پر گامزن کیا ہے۔ اُس طاقت پر اعتماد، اُس کا قرب ہی اِنسان کو پریشانی سے بچا سکتا ہے، اُس کا تقرّب ہر طرح کے افسوس سے بچاتا ہے، اُس کی نزدیکی ہر طرح کے خوف سے نجات دیتی ہے، اُس پر اعتماد اِنسان کو حزن اور اندیشے سے آزاد کر دیتا ہے — اور جو خوف اور حزن سے آزاد ہو گیا، اُسے کیا پریشانی —!! جس نے اپنے آپ کو مالک کے سپرد کر دیا اُسے کیا پریشانی! جو اپنے آپ سے نجات پا گیا اُسے کیا پریشانی! خالق کا باغی ہمیشہ پریشان رہے گا — خالق کا دوست کبھی نہیں!!

مجبُوری

مجبور ہونا کوئی بُری بات نہیں اور سچ پوچھو تو مجبور ہونا کوئی اچھی بات بھی نہیں۔ مجبور ہونا صرف سچّی بات ہے۔ اِنسان مجبور ہے۔ اِنسان مجبوری توڑنا چاہتا ہے اور فطرت اسے مجبور رکھنا چاہتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے راستوں پر مجبور ہیں۔

صرف اِنسان ہی نہیں، کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے اپنے حصار میں مجبور ہے۔ ستارے اپنے اپنے مدار میں مجبور ہیں۔ سورج طلوع و غروب کے مسلسل عمل میں مجبور کر دیا گیا ہے۔ ہر شے اپنے اپنے دائرے میں گویا رہن رکھ دی گئی ہے۔ دریا کی رَوانی اُس کی مجبوری ہے۔ پرندوں کی پرواز، مچھلی کا تیرنا، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، پہاڑوں کا اپنی جگہ پر میخوں کی طرح گڑا رہنا، مجبوری ہی مجبوری ہے۔ آسمان بلند ہے، زمین ہموار ہے، پست۔ غرضیکہ ہر ذات اپنی صفات کے بندھن میں ہے۔ اپنی عادت اور فطرت کے مطابق اپنے مجبور سفر پر گامزن ہے۔

کوئی شے، کوئی ذات اپنی تشکیل سے باہر عمل نہیں کر سکتی۔ یہی مجبوری ہے، یہی پہچان ہے اور یہی اُس ذات کی خودی ہے۔ گوشت کھانے والا مر جائے گا لیکن گھاس نہیں کھائے گا۔ شاہین مردار نہیں کھاتا، گِدھ مردار ہی کھائے گا— مجبور ہیں دونوں!

ایک اِنسان کا عمل دُوسرے اِنسان کے عمل سے مختلف نظر آتا ہے۔ ایک کا پیشہ دوسرے کے پیشے سے الگ ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی کے علاوہ ہے۔ ایک کا حاصل دوسرے کے حاصل سے جدا ہے۔ ایک کی صفات دوسرے کی صفات سے علیحدہ ہیں۔ ایک کا انداز دوسرے کا انداز نہیں۔ محنت کرنے والا نکمّے سے مختلف تو ہو گا۔ سونے والے اور

جاگنے والے برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی الگ الگ نتیجے ہیں۔ جہاں ایک اِنسان مجبور نظر آتا ہے، وہاں دُوسرا اِنسان اُس مجبوری کو توڑتا ہُوا دکھائی دیتا ہے۔ اِنسان جو چاہے کر سکتا ہے۔ اُس نے آج تک جو چاہا کیا، لیکن اِسی آزادی میں ہی تو اُس کی مجبوری کی داستان پنہاں ہے۔

اِنسان آسمان کی وسعتوں میں چلا جائے، وہ آسمان کے دروازے کھٹکھٹائے، کائنات کے اَسرار دریافت کرے، آزاد ہے — لیکن اِس آزادی میں ایک ایسا وقت آتا ہے جب اُس کی آزادی اور آزاد رَوی اُس کے لیے مجبوری کا پیغام لاتی ہے اور آسمانوں پر بھی اُڑنے والا آزاد اِنسان مجبور ہو کر زمین پر آتا ہے اور پھر زمین میں سما جاتا ہے۔ اِبتدا مجبور ہے، اِنتہا مجبور ہے۔ درمیان میں آزادی ہے — کتنی آزادی ہو گی؟

اِنسان اپنے لیے مکان بناتا ہے۔ وہ آزاد ہے۔ جیسے چاہے مکان بنائے، لیکن ایک قسم کا مکان بنانے کے بعد وہ اپنے مکان کو زیادہ تبدیل نہیں کر سکتا۔ آزادی سے حاصل ہونے والی شے اپنے مالک کو مجبور کر دیتی ہے۔ شادی کرنے تک اِنسان خود کو آزاد سمجھتا ہے۔ جس سے چاہے شادی کر لے لیکن شادی کے بعد مجبوری کا اِحساس ہوتا ہے۔ اُس کے لیے آزادی سے حاصل ہونے والی بیوی دراصل اُس کی مجبوری تھی۔ آزاد نظر آنے والی طرزِ حیات درحقیقت ایک مجبور طرزِ حیات ہے۔ اِنسان سفر کرنے کے بعد سمجھتا ہے کہ اُس کے لیے وہی سفر مقرر تھا جو اُس نے کیا۔ باقی سارے آزاد نظر آنے والے راستے صرف اِمکانات تھے۔ حقیقت صرف ایک راستہ ہے جس پر چلنا اِنسان کی مجبوری ہے۔ اُسے وہ آزادی سمجھے تب بھی مجبوری ہے اور مجبوری سمجھے تو بھی مجبوری ہی ہے۔

ہر اِنسان اپنے مزاج میں مجبور کر دیا گیا ہے۔ بخیل، بخیل رہے گا — سخی، سخی۔ ماننے والے ماننے پر مجبور ہیں اور اِنکار کرنے والے اِنکار پر۔ دُنیا میں رونقیں مجبوریوں کے ابواب ہیں۔ مجبوری کے دَم سے یہ معمورہ آباد ہے۔

ایک گھر میں پیدا ہونے والے، ایک دستر خوان پر پرورش پانے والے ایک جیسا

ذائقہ، ایک جیسی فطرت نہیں رکھتے۔ ہر اِنسان ایک الگ فطرت پر پیدا ہوا — ایک الگ تجربہ، ایک علیحدہ نصیب۔ غرضیکہ ہر اِنسان اپنے مزاج میں رہن رکھ دیا گیا ہے۔ ہر اِنسان اپنی تشکیل کے مطابق عمل پر مجبور ہے۔ اِنسان کی صفات اُس کو آزادی کی منزل دکھاتی ہیں، لیکن یہ صفات اپنی ذات میں محدود و مجبور ہیں۔ اِنسان کی بینائی لامحدود وسعتوں کو دیکھنے کی خواہش مند رہتی ہے، لیکن بینائی محدود ہے۔ دُور سے نظر آنے والے مناظر قریب سے ویسے نہیں دکھائی دیتے۔ چاند دُور سے کچھ اور ہے، اور قریب سے کچھ اور۔ ہماری نظر ہی فریبِ نظر ہے۔ جو نظر آتا ہے، وہی نظر کا دھوکا ہے۔ اس پر ہی اکتفا نہیں! ہماری بینائی محدود تو ہے ہی سہی، کچھ عرصہ کے بعد کمزور بھی ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بینائی پر ہی کیا موقوف، ہمارے اعضاء مضمحل ہو جاتے ہیں۔ ہم صحت کا خیال رکھتے رکھتے صحت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ زِندگی کی حفاظت کرتے کرتے ہم غیر محفوظ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہمارے اثاثے ہمارے اختیارات کی طرح ہم سے چھننے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہماری بینائی کمزور ہو جائے تو چہروں کے چراغ بجھ جاتے ہیں۔ ہم بیرونی خطرات سے محفوظ بھی ہوں تو بھی خطرات ہمارے اندر گھنٹیاں بجاتے ہیں۔ اندیشے، گمنام اور بے نام اندیشے، ہمارے یقین کو گھُن کی طرح کھا جاتے ہیں۔

ہم آزاد تو ہیں، لیکن یہ آزادی ایک محدود دائرے میں ہے۔ ہم اُس کے محیط سے باہر نہیں جا سکتے۔ جس طرح ہم زمین و آسمان کے حصار میں ہیں، اُسی طرح ہم اپنے حالات و خیالات کے حصار میں ہیں۔ ہم اپنے آپ سے باہر نہیں نکل سکتے۔ اپنے قد اور اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے۔ سُود و زیاں کی سرحد ہمارے اعمال کی حد ہے۔ ہم اپنوں سے بیگانہ نہیں ہو سکتے اور بیگانوں کو اپنا نہیں سکتے۔ ہمارا حاصل محدود ہے اور ہماری تمنائیں لامحدود۔ ہم داستانِ ہستی مکمل نہیں کر سکتے۔ کسی کا آغاز رہ گیا، کسی کا انجام۔ ہم جس راستے پر ہیں، اُسی راہ میں لُٹ جاتے ہیں۔ ہمارا ہونا، نہ ہونا ہو جاتا ہے اور ہم، ہم نہیں رہتے۔ آزادیاں واہمہ نظر آتی ہیں، لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اپنے اعمال کی وجہ سے جواب دہ ہوں گے۔ اِنسان اُتنا ہی

ہے، جتنی وہ کوشش کرتا ہے۔ یہی اَمر تو قابلِ غور ہے۔ مجبوریوں کے حصار میں رکھے ہوئے اِنسان کو آزادی کا پیغام ہے۔ عجب مقام ہے۔

اِنسان کو جتنی آزادی دی گئی ہے، اُتنا ہی اُسے جواب دہ بنایا گیا ہے۔ زِندگی کے محدود ایّام میں ہمارا عمل اپنے نتیجے اور اپنی نیّت کے حوالے سے جواب دہ ہے۔ کھانا کھانا تو فرض ہے یعنی مجبوری ہے، لیکن حلال حرام کی تمیز میں اِنسان آزاد ہے۔ کھانا تو کھائے گا اِنسان، لیکن کیسے ؟ — حلال یا حرام۔ رِزق کے اِنتخاب میں ہم جواب دہ ہیں۔ اِنسانوں سے سلوک میں ہم جواب دہ ہیں۔ عبادات کے سلسلے میں ہم جواب دہ ہیں۔ اِنسان میں جتنی صلاحیت ہے اُتنا ہی وہ جواب دہ ہے۔ اندھا آدمی بینائی کے حوالے سے جواب دہ نہیں۔ ہمیں جو ملا، اُس کے اِستعمال میں ہم جواب دہ ہیں۔ ہمارا فطری حاصل مجبوری ہے اور اِس حاصل کے اِستعمال میں ہم آزاد ہیں، جواب دہ ہیں۔

آزادی یہ ہے کہ ہم مجبوریوں کو کیسے استعمال کرتے ہیں۔ ہم نے بینائی سے کیا دیکھا — نیک مقامات کی زیارت یا نفس کے عشرت کدے۔ ہم نے محدود زندگی کو کیسے استعمال کیا۔ گلہ شِکوہ، شکایت، مایوسی، بغاوت یا اُسے شکر، اُمید، اِطاعت اور عبادت میں صَرف کیا۔ پانے والے رازِ حیات پا گئے اور کھونے والے اپنا آپ برباد کر کے رخصت ہوئے، ویرانیاں چھوڑ گئے۔ ایک اِنسان نے کہا کہ جب مَر ہی جانا ہے تو عمل کیا ہے۔ دُوسرے نے کہا، چونکہ مَر جانا ہے، اِسی لیے تو عمل ضروری ہے۔ کچھ لوگ اِسی مجبور زِندگی میں بے بسی محسوس کرتے ہیں اور مایوسی سے نکل نہیں سکتے۔ کچھ لوگ اِسی مجبور زِندگی میں اُمّید کے چراغ روشن رکھتے ہیں، عمل میں سرگرم رہتے ہیں اور اِس زِندگی اور آنے والی زِندگی کو کامیاب بنا لیتے ہیں۔ مجبوری اور آزادی اِنسان کے اپنے اندازِ فِکر کے نام ہیں۔ خالق کے باغی آزادیاں چاہتے ہیں۔ اُنہیں قدم قدم پر مجبوری روک لیتی ہے۔ تسلیم کرنے والے مجبوریوں میں مطمئن ہیں۔ اُنہیں قدم قدم پر نئی آزادیوں سے تعارف ہوتا ہے۔

اِنسان کا عجب حال ہے۔ زندگی غیر مستقل ہے اور اِس میں مستقل رہنے کی آرزو انسان میں پکتی رہتی ہے۔ اِنسان ریٹائر ہونے سے پہلے مستقل ہونا چاہتا ہے۔ اِس زندگی کا مزاج ہی بے ثباتی ہے۔ اِس میں کسی کو ہمیشہ قیام نصیب نہیں ہوا۔ آنے والا ضرور جائے گا اور پیدا ہونے والا ضرور مرے گا، لیکن اِسی مجبور سرزمینِ حیات میں آزادی کے گلاب کھلتے رہتے ہیں۔ بات اِحساس کی ہے، انداز کی ہے۔ زندگی کے نصیب میں مجبوری ہے اور اِس کے مزاج میں آزادی ہے۔ ہم نہ ہمیشہ سو سکتے ہیں، نہ ہمیشہ جاگ سکتے ہیں۔ زندگی کے ابدی نظام کو خوشی سے قبول کرنے والا ہی راحت حاصل کرتا ہے۔ زندگی کی گھٹن اور مجبوری کو اہلِ دل حضرات، اہلِ عشق، اہلِ محبّت حضرات نے آزادی کا نغمہ بنا کر دکھایا ہے۔ فنا کی بستی میں بقا کے مسافر مجبوریوں سے آزاد کر دیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے وجود سے نکلیں تو چاہنے والوں کے دِل میں یاد بن کر ہمیشہ کے لیے موجود رہتے ہیں۔ محبّت مجبور کو مختار بنا دیتی ہے۔ عشق مجبوریوں کے حصار سے آزاد ہو جاتا ہے۔ بندۂ آزاد، بندۂ محبّت ہے، شکم پرست ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجبور۔

جمہوریّت

جمہوریت ایک ایسا نظامِ سیاست ہے جس کی تعریف بس سے باہر ہے۔ دُنیا والوں کے ہاں اِس کی تعریف یہ ہے کہ عوام کی لائی ہوئی، عوام کی حکومت، عوام کی خاطر۔ اگر دِینی معاشرے میں طرزِ حکومت کی تعریف مقصود ہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دِینی حکومت دراصل اللہ کی حاکمیت ہے، اللہ کے بندوں پر، اللہ کی خاطر۔ دونوں میں فرق صاف ظاہر ہے۔ جمہوریت اپنے تمام تر فوائد کے باوجود کبھی دِینی حکومت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا دِینی معاشرے میں جمہوری طرزِ حکومت کا قیام صرف ناممکن ہی نہیں، نامناسب اور نارَوا ہے۔

اوّل تو اللہ کا ہونا ہی اِنسانوں کے ووٹوں سے نہیں۔ اللہ خود جمہوریت کے مزاج سے بہت بلند ہے۔ لوگ مانیں یا نہ مانیں، وہ اللہ ہے۔ اللہ کے پیدا کیے ہوئے اِنسان اللہ کو نہیں مانتے۔ اُس کی حاکمیّت کو اور اُس کے اِقتدارِ اعلیٰ کو فرق نہیں پڑتا۔ زمین و آسمان کے لشکر اگر باغی بھی ہو جائیں تو بھی اللہ مالک رہتا ہے، خالق رہتا ہے، مالک الملک رہتا ہے۔ فانی مخلوق کو باقی رہنے والی ذاتِ مطلق کے وجود اور اُس کی حکومت کے بارے میں ووٹ دینے کا حق ہی کیا ہے؟

کسی اِنسان کی مرضی ہو یا نہ ہو، اللہ، اللہ ہی ہے — حیّ و قیّوم، قائم و دائم، اعلیٰ و ارفع، قیّم، قدیم۔ اللہ کا مزاج جمہوریت سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی اکثریت کے سامنے جواب دہ نہیں۔ جبھی تو وہ اللہ ہے۔ اللہ تو اللہ ہے ہی سہی، اللہ کے پیغمبر بھی اِنسانوں کے ووٹ اور کثرتِ رائے سے نہیں بنتے۔ جس طرح اللہ، اللہ ہے، اُسی طرح پیغمبر بھی پیغمبر ہی ہے۔ کثرتِ رائے کا کسی نبی کی نبوّت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ تو پیغمبروں کی بات ہے۔ اب ذرا غور کریں۔ پیغمبرِ آخر الزّماں ﷺ کے بارے میں — آپ ﷺ اِمامُ الانبیا ہیں اور آپ ﷺ کا مرتبہ نبیوں کے ووٹ کا محتاج نہیں۔ آپ ﷺ جو کچھ بھی ہیں، اِنسانوں کی رائے سے نہیں، اپنے خداداد مرتبے سے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپ ﷺ جیسی صفات بھی رکھتا ہو اور اُس کے ماننے والوں کی کثیر تعداد بھی ہو تو بھی اُس کا مرتبہ آپ ﷺ کے مرتبے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ آپ ﷺ کا اُمّتی ہونے کا شرف حاصل کر سکتا ہے۔ پیغمبر اِنسانوں کی رائے یا اپنی صفات کے بل بوتے پر پیغمبر نہیں۔ وہ اللہ کے فیصلے سے پیغمبر ہیں، اللہ کے دیے ہُوئے مرتبے سے، اِنسانوں کی رائے یا فرشتوں کی کثرتِ رائے سے نہیں۔ ذاتِ مُطلق کی مرضیِ مُطلق سے آپ ﷺ پیغمبر ہیں۔ آپ ﷺ کا مقام اِنسانوں کا دِیا ہوا نہیں، اللہ کی عطا سے ہے۔

پیغمبر کے پیغمبر ہونے میں جمہوریت کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ آیئے اِسلام کی طرف — مسلمانوں کی رائے سے دِینِ اِسلام، اِسلام نہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے، اِسلام اِسلام ہے۔ یہ دِین کثرتِ رائے کے احترام سے دِین نہیں بنا۔ یہ اللہ کے حکم سے ہے — اللہ کی مرضی سے، اللہ کی عطا سے، اللہ کے فیصلے سے۔ جمہوریت کا اِس میں دُور تک دخل نہیں۔ اگر دُنیا کی کثیر آبادی غیر مسلم ہو تو اِس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اِسلام خدانخواستہ غلط دِین ہے۔ اِسلام سچّا دِین ہے۔ اِسلام کے ماننے والے اقلیّت میں ہوں، تب بھی یہ سچّا ہے۔ اِس کے ماننے والے ختم بھی ہو جائیں، تو بھی یہ دِین سچا دِین ہے۔ جمہوریت دِین کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی۔

اِسلام سے پہلے جتنے دِین تھے، اُنہیں جمہوری رائے عامہ کے حوالے کر کے ختم کر دیا گیا۔ اُنہیں کثرتِ رائے اور مطلب پرست حکمرانوں نے ہی ختم کیا۔ اِسلام نہ کسی بادشاہ کے فیصلے سے بدل سکتا ہے، نہ عوام کی کثرتِ رائے سے۔ اِسلام میں کسی مارٹن لوتھر کی گنجائش ہی نہیں۔ اِس دِین کو "دِینِ اِلٰہی" بنانے کا مشورہ دینے والے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غرق کر دیے

گئے۔ اِس دِین میں نہ کوئی ترمیم ہو سکتی ہے، نہ تخفیف۔ یہ ہے، ویسے کا ویسا، جیسے تھا۔ کثرتِ رائے کو احکامِ دِین کے تابع رہنا پڑے گا۔ جمہوریت اور "دِینیّت" ہم سفر نہیں۔ اگر عوام کی کثیر تعداد صداقت سے عاری ہو تو دِینی نظامِ صداقت کے لیے ووٹ کون دے گا؟ جھوٹے معاشرے میں سچّا اِنسان کس سے ووٹ مانگے گا؟

روٹی، کپڑے اور مکان کے نام پر جو جمہوریت قائم ہوئی تھی، اُس کا عمل اور اُس کا حشر ہم دیکھ چکے ہیں۔ اِسلام کے نام پر جمہوریت کا قیام دراصل اِسلام اور جمہوریت دونوں سے مذاق ہے۔ اِسلام، اِسلام ہے اور جمہوریت، جمہوریت۔ اِسلام صداقت پر مبنی ہے اور صداقت اکثریت میں نہیں۔ جمہوریت اکثریت کی حکومت ہے اور اکثریت دِین سے بیزار ہے۔

غور طلب بات ہے کہ جمہوریت کے ذریعے دِینی معاشرہ کیسے قائم ہو گا؟ دِینی حکومت کیونکر قائم ہو گی؟ اگر اکثریت غلط فیصلہ کرے تو انجام، دِین کے حق میں کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر یزید اور اُس کے ساتھی اکثریت میں ہوں، تو بھی صداقت امامِ عالی مقامؓ کے عمل میں ہے۔ یہی بات تو یزید کے ماننے والوں کو سمجھ میں نہیں آئی کہ حُسینؓ تنہا ہے اور سچّا ہے۔ یزیدی اکثریت میں ہیں اور جھوٹے ہیں، اُن کی حکومت ہے اور وہ جھوٹے ہیں۔

صداقت اور اِمامت کے کربلا سے گزرنے کی وجہ ہی یہی ہے کہ اکثریّت والے کثرتِ رائے کی وجہ سے بھول گئے کہ اِسلام کثرتِ رائے کی بات نہیں، اِطاعت و محبّتِ مصطفیٰ ﷺ کی بات ہے۔ اللہ سے محبّت حضور ﷺ کی اِطاعت میں ہے اور حضور ﷺ کی محبّت اللہ کی اِطاعت میں ہے۔ اگر ووٹ کو ضرورت بنا دیا گیا تو سچ اور جھوٹ کی تقسیم ختم سی ہو جائے گی۔ ایک قادیانی کا ووٹ ایک مفتیٔ دِین کے ووٹ کے برابر ہو جائے گا۔ غضب ہو جائے گا۔ جھوٹا ووٹ، سچے ووٹ کے برابر—!

آج تک اِسلام کے نافذ نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں سے رائے مانگی جاتی رہی، ورنہ مسلمانوں پر اِسلام کے نافذ نہ ہونے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اللہ کے بندوں پر اور اللہ

کے ماننے والوں پر، اللہ کے دِین کو نافذ نہ کرنے کی وجہ؟ کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ غلطی ضرور موجود ہے۔ کیا جمہوریت اِس غلطی کو دریافت کر کے اِسے دُور کرے گی؟ قطعاً نہیں۔ جمہوریت اپنا نفاذ کرے گی، دِین کا نہیں، اور نتیجہ کیا ہو گا! اِس کا سمجھنا مشکل نہیں۔

جمہوریت کا سفر جلسوں کا سفر ہے، جلوسوں کا سفر ہے، تقریروں کا سفر ہے، جھوٹ سچ ملا کر بولنے کا سفر ہے، حکومتِ سابقہ کی مخالفت کا سفر ہے، گٹھ جوڑ اور توڑ پھوڑ کا سفر ہے۔ جس طرح امن دو جنگوں کے درمیانی وقفے کا نام ہے، اُسی طرح کہیں جمہوریت مارشل لاء اور مارشل لاء کے درمیانی عرصے کا نام نہ ہو۔ جمہوریت جوہر شناس نہیں۔ جمہوریت صرف مقدار کی قائل ہے، معیار کی نہیں۔

جمہوریت سُقراط کو زہر پلاتی ہے۔ منصورؒ کو سُولی پر چڑھاتی ہے۔ عیسیٰؑ کا احترام نہیں کرتی۔ جمہوریت کے ذریعے کوئی مفکر، اِمام، دانشور، عالمِ دِین، وَلی یا مردِ حق آگاہ برسرِ اِقتدار نہیں آسکتا اور جو لوگ جمہوریت کے مہنگے راستوں سے اِیوانِ اِقتدار میں آتے ہیں، اُن کو دِینی حکومت کے قیام سے کیا غرض! جب تک عوام میں حق پسند، حق طلب اور حق آگاہ لوگوں کی کثرت نہ ہو، جمہوریت ایک خطرناک کھیل ہے!!

۩۩۩

خطرہ

اگر اینٹوں میں رَبط نہ ہو تو آندھی تو کُجا، دِیوار کو اپنے ہی بوجھ سے گر جانے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ اندرُونی کمزوری کو بیرونی خطرات ہمیشہ دَرپیش رہتے ہیں۔ شکستہ جہاز کو کوئی ہوا بھی تو راس نہیں آتی۔ بیمار وجود کے لیے ہر موسم خطرے کا موسم ہے۔ قوّتِ مدافعت نہ رہے تو بیماری کا شائبہ بھی زِندگی کے لیے خطرہ ہے۔

جب قوموں کے اندر وَحدت نہ رہے تو اِس اِنتشار کی سزا ایک نامعلوم خطرے کی شکل میں موجود رہتی ہے۔ مایوس اِنسان پر خطرات کی وبا کا عذاب نازل کیا جاتا ہے۔

آج ہمارے گرد و پیش خطرات ہیں۔ ہمارے یسار و یمین میں خطرہ ہے۔ ہمارے دروازے پر خطرہ دستک دے رہا ہے۔ ہم کرب سے گزر رہے ہیں۔ مکینوں کو اپنے مکان میں سکون نہیں۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت میں کوئی نہ کوئی خطرہ موجود ہے۔

آج کی دُنیا کو ترقی کے حوالے سے تین قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور پس ماندہ۔ ترقی یافتہ وہ ممالک ہیں جو خوف پیدا کرتے ہیں۔ ترقی پذیر وہ ممالک ہیں جو خوف زدہ رہنے پر مجبور ہیں اور پس ماندہ وہ ممالک ہیں جنہیں خطرے کے اِحساس سے بھی آشنائی نہیں۔ جنہیں زندگی کا اِحساس نہ ہو، اُنہیں موت کا کیا خوف!

خوف اور خطرہ صرف ترقی پذیر ممالک کے لیے ہے۔ ہم ترقی پذیر ہیں۔ ہم خوف میں ہیں۔ ہمارے مغرب میں ترقی یافتہ رُوس ہے جو خوف پیدا کرتا ہے۔ مشرق میں ایک ایسا ملک ہے جو ترقی پذیر ہونے کے باوجود ترقی یافتہ اَنداز رکھتا ہے۔ بھارت خود خوف میں ہے، لیکن

خوف پیدا کرتا ہے۔

ترقی کا دوسرا نام خوف پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ بھارت کے پاس یہ صلاحیت ہے۔ اُس کی نگاہ میں آج بھی یہ پاکستان خار بن کر کھٹکتا ہے۔ اِس کی وجوہات کچھ بھی ہوں، نتیجہ یہ ہے کہ ہم خطرے میں ہیں۔

دوست کمزور ہو جائیں تو دشمن خود بخود طاقتور ہو جاتا ہے۔ اندرُونی اِنتشار، بیرونی یلغار کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ہم ایک ایسے خطرے میں ہیں جو محسوس تو ہوتا ہے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ خطرہ کس چیز سے ہے۔

کیا ہم پر خدانخواستہ کوئی نئی اُفتاد پڑنے والی ہے؟

کیا ہم اپنے اعمال کی عبرت کے خوف میں ہیں؟

کیا ہم اپنے راہنماؤں سے مایوس ہو چکے ہیں؟

کیا ہم گردشِ حالات کی زد میں آ چکے ہیں؟

کیا ہم سے زندگی کے عظیم مقاصد چھن چکے ہیں؟

کیا ہم اعتماد سے محروم ہو چکے ہیں؟

کیا ہمیں اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں؟

کیا ہمیں جان کا خطرہ ہے، ایمان کا خطرہ ہے، عزت کا خطرہ ہے، ملکی سلامتی کا خطرہ ہے، ملّی وَحدت کا خطرہ ہے؟

کیا خطرہ ہمارے اندر ہے یا باہر ہے؟

کیا آسمان گرنے والا ہے؟

کیا زمین پھٹنے والی ہے؟

کیا اِنسان کے گناہوں کا بوجھ اِتنا بڑھ چکا ہے کہ کسی عذاب کا نازل ہونا ناگزیر ہے؟

کیا ہماری تاریخ ختم ہونے والی ہے؟

کیا ہم ایک سطحی اور نقلی زِندگی گزار رہے ہیں؟

کیا ہمارے افکار پریشان ہیں؟

کیا ہمارا کردار ختم ہو چکا ہے؟

کیا ہم سے حُسنِ عمل چھن گیا ہے؟

کیا ہم دُعاؤں کا آسرا بھول چکے ہیں؟ ہم قدم قدم پر خطرے میں ہیں؟

کیا ہمارا عمل بیان اور صرف بیان ہے؟

کیا ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں؟

آخر ہم نے کیا کِیا ہے کہ ہم خطرے میں ہیں؟

یہ سب سوال ہی سوال ہیں اور خطرہ یہ ہے کہ جواب نہیں ہے۔ ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔ ہم پچھلے چالیس سال سے یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم نے یہ مُلک کیوں بنایا۔ ہمیں اِتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم نے یہ ملک حکمرانوں کے لیے بنایا ہے۔ یہ اللہ کا شکر ہے کہ اب حکمران ہم میں سے ہی ہیں۔ مزاج—! حکمرانوں کے مزاج نہیں دیکھا کرتے، دیکھنے والی بات صرف یہ ہے کہ محکوم کی حالت کیا ہے۔ محکوم اگر مسلسل مظلوم اور محروم ہو، تو حکمرانوں کے ایمان کا کیا تذکرہ؟ محکوم مظلوم ہو، تو حکمران کو کیا کہتے ہیں؟ آج پاکستان میں الحمدُللہ! ہم سب مسلمان ہیں۔ چور کون ہے؟ ڈاکہ کس نے ڈالا؟ کس نے کس کی عزت کو تباہ کِیا؟ مسلمانوں کے عظیم ملک میں کسی غریب پہ کیا بیتی؟ کون بتائے؟ کیا اللہ صرف طاقتور کا ساتھ دیتا ہے؟ کیا ہم لوگ ایک دوسرے کی پہچان سے محروم ہو گئے ہیں؟ کیا ہم کسی عاقبت کے قائل نہیں رہے؟

ہم کروڑوں انسان، سارے کے سارے تنہا—افراتفری، ایک دوسرے پر الزام تراشی، ایک دوسرے کے ساتھ نااِنصافی، وعدہ شکنی، مطلب پرستی، ہوس پرستی، زَرپرستی، منصب پرستی اور ظاہر پرستی—خطرہ تو ضرور ہو گا۔

مظلوم کی بد دُعا خطرہ پیدا کرتی ہے۔ محروم کی آہ خطرہ پیدا کرتی ہے۔ یتیم کی فریاد پانی میں آگ لگا دیتی ہے۔

جس بستی سے حق والا محروم ہو کر نکلے، وہ بستی ویران ہو جاتی ہے!

آج ہمیں سوچنا پڑے گا کہ آخر ہم کس طرف کو جا رہے ہیں۔ ہم کہاں سے چلے تھے۔ ہمارا حال کیا ہے۔ ہمارے اندیشے اِتنے بے سبب بھی نہیں۔

ہم ایک دفعہ پہلے تقسیم ہو چکے ہیں۔ ہم ایک دفعہ پہلے بھی کٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس آج بھی حالات اچھے نہیں اور دشمن پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ ایک دفعہ ہونے والا حادثہ، کیا دُوسری دفعہ نہیں ہو سکتا؟ خوف تو ہو گا!

لیکن، نہیں۔ بات اِتنی خطرناک بھی نہیں۔ دامنِ اعمال خالی ہو تو ہو، دامنِ رحمت تو بھرا ہوا ہے۔ ہمارا سہارا ہمارے اعمال میں نہیں، اُس کی رحمت میں ہے۔ رحمت کا کام ہی یہ ہے کہ محروم کو حق سے سِوا دیتی ہے۔ وہ دینے والا ہے۔ جب چاہے، جسے چاہے، جو چاہے، دے دے۔ ہماری بقا صرف ہماری ہی بقا نہیں، اُس کے نام کی بھی عظمت ہے۔

جب ہم غلام تھے تو ہم نے ہندوستان میں اپنی آزادی کو حاصل کِیا۔ ایک نیا ملک بنایا۔ آج تو ہم آزاد ہیں۔ ہم مُلک کا تحفظ کیسے نہیں کریں گے۔

ہم دشمن سے ڈرنے والے نہیں۔ ہمیں اگر کبھی خوف ہوا تو صرف دوستوں کا — اپنوں سے ڈر ہے۔ اپنے، اپنے ہو جائیں تو بیگانے کا کیا خوف!

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی صفوں میں اِتحاد پیدا کریں۔ اپنے اعمال اور اپنے مال میں سب کو شریک کریں۔ دُوسروں کی عزت کریں تاکہ ہماری عزت محفوظ ہو۔ دشمن کوئی حرکت کرنے سے پہلے دس دفعہ سوچے گا۔ ہمیں اپنی حفاظت کے لیے کسی سوچ کی ضرورت نہیں۔ ضرورت صرف وَحدت اور صداقت کی ہے۔ ہمیں بے راہ زندگی کا خوف ہونا چاہیے۔ اُس کی راہ میں مرنا ہمارے لیے خوف کا نہیں، شوق کا باعث ہے۔ ویسے اُس کی راہ، حق اور

حقیقت کا راستہ ہے—بھائی کے لیے وہ چیز پسند کرنے کا راستہ، جو اپنے لیے پسند ہو۔ انصاف قائم ہو جائے، خطرہ ٹل جائے گا۔

سینے میں ایمان بیدار ہو جائے، خوف نکل جائے گا۔ یقین زندہ ہو جائے، موت ختم ہو جائے گی۔ دولت کی محبّت کم کر دو، اندیشے کم ہو جائیں گے۔ سیاست سے جھوٹ نکل جائے، دِل سے خوف نکل جائے گا۔

لالچ خوف پیدا کرتا ہے۔ اندرُونی اِنتشار، بیرونی سرحدوں پر خطرے کی شکل میں نظر آتا ہے۔ خطرہ بہر حال اندر رہے، باہر نہیں!!

قیادت

جب قائدین کی بہتات ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ قیادت کا فقدان پیدا ہو گیا— قائدین کی کثرت، ملّت کو تقسیم کر کے راستے کے تعیّن کو دشوار بنا دیتی ہے—وحدتِ مقصد ختم ہو جائے تو کثیر المقصدیت پیدا ہو جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منزل کا مفہوم ہی مبہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہر قائد اپنے گروہ کو الگ الگ سمت دکھاتا ہے، الگ الگ شعور عطا کرتا ہے، الگ الگ ضرورتیں پیدا کرتا ہے اور علاج کے الگ الگ طریقے ایجاد کر کے ذہنوں کو اُلجھا دیتا ہے۔ ہر شخص پاکستان اور پاکستانی قوم کو کنارے لگانا چاہتا ہے اور ہر قائد ایک الگ کنارے کی نشاندہی کرتا ہے، نتیجہ یہ کہ کشتی منجدھار میں رہتی ہے۔

قیادت مسیحائی کی طرح ایک وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے، قوم کا پریشان ہونا منطقی نتیجہ ہے—ہر قائد پاکستان کے زوال کے اسباب بیان کرنے میں رطب اللسان ہے اور عروج کا راستہ اپنی ذات تک مخفی رکھا جاتا ہے، یعنی عروج کے لیے اس قائد کے ہمراہ چلنا شرط ہے۔ قوم کے پاس اتنے رہنما ہیں کہ بس خدا کی پناہ۔ راستہ ہی دشوار ہو کے رہ گیا ہے۔ آج کا ہر قائد اپنی صداقت کا حوالہ ماضی سے لیتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے یہ فرمایا، وہ فرمایا—لہٰذا قوم پر لازم ہے کہ وہ اِس کی جماعت میں شامل ہو جائے—ہر قائد، اقبالؒ کے کسی شعر سے آغازِ تقریر کرتا ہے اور اقبالؒ کے ہاں اتنے اشعار ہیں کہ ہر سیاسی جماعت کے منشور کے لیے اقبالؒ ہی سند ہے۔ سلطانیِ جمہور کے زمانے کی نوید ہو کہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا ذکر، دیوِ استبداد کا تذکرہ ہو کہ

غریبوں کو جگانے اور کاخِ اُمراء کے دَرودِیوار ہلانے کی بات ہو، اقبالؒ کے کلام میں موجود ہو گی—اقبالؒ انسانوں کی طرف سے اللہ کے سامنے شکوہ کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے انسانوں کو جوابِ شکوہ مہیا کرتا ہے—اس کے کلام میں کیا بات نہیں ہو گی۔ اقبالؒ ترقی پسند ہے، ارتقاء کا قائل ہے، استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے، مساوات کا درس دیتا ہے—بندہ و بندہ نواز کو ایک ہی صف میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اقبالؒ کا کلام آج کے بہت سے قائدین کے لیے نعمت ہے۔ اس کے برعکس کچھ جلسے ایسے بھی ہیں، جن کی ابتدا اقبالؒ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

؎ قوّتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اقبالؒ نے قیادت کو جِلا بخشی— ہر قسم کا قائد اقبالؒ کا پیروکار ہے— اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے فرمودات ہر قائد کی زبان پر رہتے ہیں اور ایک قائد دوسرے قائد کی قیادت کے خلاف ہے—یہی عجب حال ہے۔

قائدین کی اکثر تقاریر چند الفاظ میں سمٹ سکتی ہیں کہ قائدِاعظمؒ کی منشا اور اقبالؒ کی رُوح کے مطابق ملک و ملّت کی تعمیر کریں گے—غریب امیر کی تقسیم ختم ہو جائے گی اور سب لوگ چَین سے زندگی بسر کریں گے، ملک کا دفاع مضبوط ہو جائے گا—اور—اور کیا؟ انتخاب کراؤ—ووٹ دو—اور یہ کام جلدی ہونا چاہیے، ورنہ—ورنہ کیا—؟

آج کل ہم طلسماتِ رہبری کے دَور سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف اِسلام نافذ ہو رہا ہے، دوسری طرف کچھ اور نافذ ہونے کی باتیں ہو رہی ہیں— کہیں مساوات کے چرچے ہیں، کہیں نظامِ مصطفیٰ ﷺ اور مقامِ مصطفیٰ ﷺ کا ذکر ہو رہا ہے، کہیں انتخابات کا تقاضا ہو رہا ہے، کہیں احتسابات کے قصے ہیں۔ ایک شریف غیر سیاسی شہری کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اب کیا ہو گا— خطرات کے بڑھنے کا ذکر کرنے والے، ایک سیاسی نصب العین کے تحت سرگرمِ عمل ہیں— خطرات سے یکسر غافل کر دینے والے اپنی سیاسی ضروریات رکھتے ہیں—

اسلام سے محبّت بیان کرنے والے اسلام کے نفاذ کے ساتھ اپنا نفاذ بھی مشروط رکھتے ہیں۔ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نام پر اپنے عزائم پورا کرنا چاہتے ہیں۔ قوم قائدین کی کثرت سے پریشان ہے۔

یہ پریشانی دراصل ایمان کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اسلام میں قیادت کا تصور، دنیائے سیاست کی قیادت کے تصور سے الگ ہے، مختلف ہے، نرالا ہے۔ اسلام صرف پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قیادت میں زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ آپ ﷺ کی قیادت کے علاوہ کسی قیادت کی اطاعت واجب ہی نہیں۔ مومن اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے احکام کا پابند ہے۔

بات کہنے کی نہیں لیکن پھر بھی — یہ حقیقت ہے کہ ایک سادہ لوح پاکستانی کو حضور اکرم ﷺ کے علاوہ کسی اور قائد کا، خواہ وہ قائدِ اعظمؒ ہی کیوں نہ ہوں، پیغام سنا دیا جائے تو وہ بیچارہ کچھ سمجھ نہیں سکتا کہ اسے کس کا حکم بجالانا ہے۔

ایک زندگی میں ہم کس کس کی لاج نبھائیں — حکومت کا حکم ماننا کہ ہماری حکومت ہے اور اب تو منتخب ہے بلکہ نَو منتخب ہے — حکومت کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے مگر بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حکومت جلسے کیوں کرتی ہے۔ عوام کے کتنے ہی کام ہیں جو حکومت کے ذمے ہیں، انہیں ہونا چاہیے — بڑے شہروں میں ٹریفک کے مسائل ہیں — سڑکوں اور گلیوں کی حالت ہے، بجلی اور گیس کے مسائل ہیں، تعلیم کے بڑے ہی مسائل ہیں، نوکری کے حصول کی دشواریوں کے مسائل ہیں — حکومت اُن کو حل کرے اور اِس کے علاوہ قوم کو ایک واضح واحد مقصدِ حیات عطا کرے۔

اگر اسلام نافذ ہی کرنا ہے تو اللہ کی خوشنودی کے لیے کر ڈالو — لوگوں کی خوشنودی کی ضرورت ہی کیا ہے — شاید اسلام کے نفاذ کا مرحلہ مشکل ہے — اگر مسلمانوں پر اسلام کا نفاذ مشکل ہے تو — یا وہ مسلمان مسلمان نہیں، یا وہ اسلام اسلام نہیں، یا وہ قوتِ نافذہ، قوتِ نافذہ نہیں!

بہر حال اسلام میں قیادت کا تصور یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے حکم ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، اللہ کے رسولِ مقبول ﷺ کی اطاعت کرو اور اُولی الاَمر کی اطاعت کرو— اُولی الاَمر کی بحث نہیں — یہ بحث واقعۂ کربلا سے ختم ہو گئی— اُولی الامر یزید نہیں تھا، امامِ عالی مقامؑ تھے—اگر حاکمِ وقت کے اَوصاف اسلام کی منشا کے علاوہ ہوں تو اُسے اُولی الامر نہ کہو—اگر وہ اسلام میں فرماں بردار ہے تو اُس کے اُولی الامر ہونے پر غور کر لینا نامناسب تو نہیں—بہر حال یہ فیصلے علماء صاحبان کے ہیں۔

ہم پرانے قائدین کے دن مناتے ہیں۔ صرف ایّام منانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہم خود کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیدا نہیں کر سکے—چھ ستمبر کی یاد اور پھر ملک کے دولخت ہونے کی یاد، بیک وقت کیسے یاد رہے۔

ہم کچھ بھول سے گئے ہیں—ہمیں صرف قائد بننے کا شوق ہے—قائد وہ ہے جو پچھلی قیادتوں سے آزاد کر دے—اور مسلمان ماضی سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یہی اس کی خوبی ہے اور یہی اس کی خامی—خوبی اس لیے کہ مذہب ہمیشہ ماضی سے وابستہ رہتا ہے، خامی اس لیے کہ مسلمان کسی نئے تصور کو ماننے کے لیے قطعاً تیار نہیں۔ روس افغانستان کی مدد کرنے کے لیے نئے تصورِ حیات سے حاضر ہے اور مسلمان مجاہد مصروفِ جہاد ہے— امریکہ اپنے لامحدود خزانوں کے باوجود امام خمینی اور معمر قذافی کو ایک آنکھ نہیں بھاتا— مسلمان کے لیے کسی قیادت کا جادو بے اثر ہے۔ اس کے لیے صرف خدا کا رسول ﷺ بس کافی ہے— قیادت کی اطاعت اگر اسلام کے علاوہ ہو تو شرک ہے— اگر اللہ کے علاوہ معبود بنانا شرک ہے تو اسلام کے علاوہ کسی اور نظریے کی اشاعت اور اطاعت بھی شرک ہے۔ قائدین کی بہتات میں ابھی تک قائد نظر نہیں آتا—قائد وہ جس کی اطاعت ہمارا دین ہو— جس کے لیے جان نثار کرنا شہادت ہو—!

اسلام میں قیادت تقویٰ سے مشروط ہے۔ صاحبِ تقویٰ— اس زندگی کو آنے والی

زندگی کی تیاری سمجھتا ہے— وہ اللہ کو رازق سمجھتا ہے— قرآن کے احکام کے تابع رہتا ہے— اور حضور اکرم ﷺ کی قیادتِ عظمیٰ کو تا قیامت قائم و دائم مانتا ہے۔

آج ملّت کو قائدین کی بظاہر کثرت کے باوجود کسی مردِ حق آگاہ، کسی غلامِ غلامانِ مصطفی ﷺ کی قیادت کا انتظار ہے۔ رہبر وہ کہ دیدہ وَر بھی ہو— رازِ پنہاں سے باخبر بھی ہو!!

ذرّے میں صحرا

یہ عظیم و قدیم، جمیل و جسیم کائنات اِتنی پُراَسرار و پُرانوار ہے کہ اِس کا اندازہ لگانا بھی دُشوار ہے—اِس میں کیا نہیں ہے—!

یہاں وسعتیں ہیں—گردشیں ہیں—فاصلے ہیں—زمانے ہیں—بلکہ وسعت دَر وسعت، گردش دَر گردش—فاصلہ دَر فاصلہ—زمانہ دَر زمانہ—مدار دَر مدار—محور دَر محور!

اِس کائنات میں عجب کھیل ہے—زمانے زمانوں کی تلاش میں ہیں—گردشیں گردشوں کے تعاقب میں ہیں—وقت وقت کو کھا رہا ہے—زندگی موت کے حصار میں ہے اور موت زندگی کی زد میں ہے۔

کائنات بنانے والے نے اِسے بہت ہی خوبصورت اور انوکھا شاہکار بنایا ہے۔ کہیں اِتنے گرم ستارے ہیں کہ ہمارے ہاں کی آگ بھی پناہ مانگے—کہیں اتنے یخ سیارے ہیں کہ ہمارے ہاں کی برف کو بھی پسینہ آجائے—!

کائنات تو خیر ہے ہی ایک عجوبہ—لیکن یہ زمین اپنے آپ میں ایک مکمل کائنات ہے—مختصر اور محدود زمین وسیع اور لامحدود اِمکانات سے مالامال ہے۔

زمین کا حُسن ہو کہ کائنات کا حُسن—اِسے جاننے اور دیکھنے کے لیے جس مخلوق کو مقرر فرمایا گیا، وہ ایک الگ شاہکار ہے۔

اِس تماشا گاہِ عالم میں واحد تماشائی انسان ہے—اِنسان کو ایسی صفات سے نوازا گیا کہ وہ باہر کا منظر اپنے باطن میں موجود پاتا ہے—اِنسان ہی تو اِس کائنات کے رُموز سے آشنا ہے—اگر

وہ آشنا نہیں تو کون آشنا ہے؟ اسی کے لیے یہ سب جلوے ہیں — وہی اشرف المخلوقات ہے — !

آسمان کے کروڑوں ستاروں کو بیک وقت دیکھنے والا آلہ بس اِنسانی آنکھ ہے — آنکھ نہ ہو تو حُسنِ کائنات کیا ہے — روشنی کا وجود اپنے آپ میں لاکھ موجود ہو، دیکھنے والے کے بغیر عبث سا ہو کر رہ جاتا ہے — اندھوں کے لیے سورج کا جلوہ کیا حقیقت رکھتا ہے۔ بے شعور کے لیے اِس کائنات کے رُموز کیا وقعت رکھتے ہیں۔ بنانے والے نے یہ عجب کھیل بنایا ہے۔

کروڑ ہا سالِ نور کے فاصلے رکھنے والی پُر شکوہ کائنات کے اَسرار و رُموز کی آگہی کا دَم بھرنے والا ایک اِتنے چھوٹے سے سیّارے پر رہتا ہے جس کے وجود کا اِس وسیع کائنات کے حوالے سے ہونا نہ ہونا برابر ہے — اس چھوٹی سی دُنیا میں، کسی چھوٹے سے ملک میں، کسی چھوٹے سے شہر میں، کسی مکان کے اندر، ایک اِنسان اپنی چھوٹی سی عقل کے ذریعے اِس عظیم وسعت کا احاطہ کرنا چاہتا ہے — یہی نہیں — وہ اِس فطرت کے فاطر کی صفات و ذات کی آگہی کے شرف سے بھی اپنے آپ کو مفتخر مانتا ہے۔

یہ سب کیسے ہے — ؟ کیوں ہے؟ کیا ایسے ہے بھی سہی کہ نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو یہ سب کچھ ہونے کے باوجود نہیں ہے۔ اِنسان نہیں تو یہ سب کچھ کیا ہے — ؟ اگر ذاکر نہ ہو تو مذکور کون ہے؟ مذکور کو ذاکر درکار تھا — اُس نے ذِکر پیدا کیا — ذِکر ہی کے ذریعہ سے مذکور و ذاکر متعلق ہیں — !

وسعتیں حُسنِ خیال میں سمٹ کے آجاتی ہیں — کون و مکاں کے جلوے اِنسان کے دِل میں موجود ہوتے ہیں — ! زمین و آسماں کے رِشتے اِنسان ہی کے دَم سے ہیں — ساری کائنات سمٹ کے اِنسان کے دِل میں آجاتی ہے — ساجد کی پیشانی میں مسجود کے جلوے ہیں — اور مسجود خالق بھی ہے — اور خالق کائنات کے جلووں کا مالک ہے — وہ جلووں کا مالک ہے — ہم جلووں کے مستقر ہیں — ہم اُس کے جمال کا آئینہ ہیں — وہ اپنی ذات میں تنہا رہ سکتا ہے — لیکن اُس نے چاہا کہ وہ جانا جائے، پہچانا جائے — بس اُس نے مخلوق بنا دی — یہ کائنات،

عالمِ موجودات — اور پھر اِس میں اشرف المخلوقات، اِنسان —!

یہی اِنسان محدود و فانی ہونے کے باوجود لا محدود و باقی کو جاننے والا اور ماننے والا ہے — اُس کے جلوے اِس میں ہیں — اُس کا پَرتَو اِس میں ہے — وہ مخفی ہے تو یہ آشکار ہے — وہ عظیم فنکار ہے تو یہ اُس کا عظیم شاہکار ہے — اُس کو کیسے جان سکتا ہے — بس یہی وہ راز ہے جس کے جاننے سے سب کچھ جان لیا جا سکتا ہے۔

ماضی، ایک طویل ماضی سے آشنائی، آج کا اِنسان کر رہا ہے — مستقبل سے آشنائی آج کا اِنسان کر رہا ہے — آج کا اِنسان آج کے اِنسانوں کو جانتا ہے — وہ کائنات کے رُموز سے باخبر ہے — وہ سب کچھ جانتا ہے — کیسے؟

وہ اپنے آپ کو جاننے کے بعد سب کو جان سکتا ہے — خود سے آشنا سب سے آشنا ہے — ذرّے سے آشنا ہے، صحرا سے آشنا ہے — قطرے سے آشنائی قلزم سے شناسائی ہے۔

قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ جہاں کسی شے کا وجود ایک حقیقت ہے، وہاں اُس کا اِدراک ایک الگ حقیقت ہے — ہم وجود سے اِدراک کے سفر پر روانہ ہیں۔ ہو سکتا ہے، حقیقتِ وجود کا مقصد ہی تخلیقِ حقیقتِ اِدراک ہو — صاحبِ اِدراک اپنے آپ میں حقیقت کے رُوبرو رہتا ہے — وہ اپنے آئینے میں خوبصورت، رنگا رنگ نیرنگ دیکھتا ہے — وہ نظارے کو منظر کا حاصل سمجھتا ہے — صاحبِ نظر جان لیتا ہے کہ ایک منظر دوسرے منظر سے بہت مختلف نہیں — ایک آنسو کسی دوسرے آنسو سے الگ نہیں — نئے غم اور پُرانے غم سب برابر ہیں — فاطر ایک ہے تو فطرت کے سب جلوے بھی ایک ہی ہیں۔

درخت سے ٹُوٹا ہوا پتّا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی اِس کائنات کی وسعتیں — خلا کی پہنائیاں — اور بڑی بڑی کہکشاؤں کے درمیان چیختی ہوئی تنہائیاں —!

اِنسان باعثِ تخلیق بھی ہے اور حاصلِ تخلیق بھی — یہاں اِنسان کو اپنی ہستی کا اِدراک حاصل ہو جائے تو یہ کائنات وَرق وَرق اُس کے سامنے اپنے مفہوم کے ساتھ حاضر ہے

—سب جلوے ایک حُسن کا پرَتو ہیں—یہ سب کثرت ایک وحدت کے اِظہار کے لیے ہے—ہر جُز اپنے کُل کا مظہر ہے—اور ''کُل'' تو ایک ہے—اِس لیے کوئی جُز کسی دوسرے جُز سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

غریب کا دِل اتنا ہی مقدّس ہے، جتنا مغرور امیر کا۔ جس کی خدمت میں ذرّے نے اپنا دِل چِیر کے رکھ دیا ہو، اُس کے سامنے صحرا اور گردِ صحرا ایک ہی شے ہیں—بات تعلق کی ہے—نسبت کی ہے—اِدراک کی ہے—عنایت کی ہے—عطا کی ہے—ورنہ کہاں ایک چھوٹا سا دِل اور کہاں وسعتِ کون و مکاں—کہاں اِنسان اور کہاں کائنات—بس!

سلام ہو اِس کائنات کے حُسن اور اِس کی وسعتوں کو—اور سلام ہے اِس کو جاننے والے اور اِس کو چاہنے والے اِنسان کے لیے—اور سجدہ ہے اِن کو پیدا فرمانے والی ذات کی خدمت میں—!!

موت کا خوف

موت سے زیادہ خوفناک شے موت کا ڈر ہے۔ جیسے جیسے زندگی کا شعور بڑھتا ہے، زندگی کی محبّت بڑھتی ہے، موت کا خوف بھی بڑھنے لگتا ہے۔ جس کو زندگی سے محبّت نہ ہو، اُسے موت کا خوف کیا ہو سکتا ہے!

جب انسان کے دِل میں موت کا خوف پیدا ہو جائے تو اُس کی حالت عجیب ہوتی ہے —ایسے جیسے کوئی اِنسان رات کو اندھیرے سے بھاگ جانا چاہے، یا دِن کو سورج سے بھاگ جانا چاہے، بھاگ نہیں سکتا۔

کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو موت کا خطرہ اور خوف لاحق ہو گیا۔ وہ بھاگنے لگا۔ تیز بہت تیز۔ اُسے آواز آئی: ''موت تیرے پیچھے نہیں، تیرے آگے ہے''۔ وہ آدمی فوراً مڑا اور اُلٹی سمت بھاگنے لگا۔ آواز آئی: ''موت تیرے پیچھے نہیں، تیرے آگے ہے''۔ وہ آدمی بولا: ''عجیب بات ہے، پیچھے کو دوڑتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے۔ آگے کو دوڑتا ہوں تو پھر بھی موت آگے ہے؟'' آواز آئی: ''موت تیرے ساتھ ہے۔ تیرے اندر ہے۔ ٹھہر جاؤ۔ تم بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ جو علاقہ زندگی کا ہے، وہ سارا علاقہ موت کا ہے''۔ اُس آدمی نے کہا: ''اب میں کیا کروں؟'' جواب مِلا: ''صرف انتظار کرو۔ موت اُس وقت خود ہی آ جائے گی، جب زندگی ختم ہو گی، اور زندگی ضرور ختم ہو گی۔ زندگی کا ایک نام ہے، موت —زندگی اپنا عمل ترک کر دے تو اُسے موت کہتے ہیں''۔ اُس آدمی نے پھر سوال کیا: ''مجھے موت کی شکل دِکھا دو، تا کہ میں اُسے پہچان لوں'' —آواز آئی: ''آئینہ دیکھو! موت کا چہرہ تیرا اپنا چہرہ ہے۔ اِسی نے میّت بننا ہے۔

اِسی نے مُردہ کہلانا ہے۔ موت سے بچنا ممکن نہیں"۔

موت کے خوف کا کیا علاج! لاعلاج کا بھی کوئی علاج ہے! لاعلاج مرض، مہلک مرض صرف زندگی کا عارضہ ہے، جس کا انجام صرف موت ہے۔ زندگی ایک طویل مرض ہے، جس کا خاتمہ موت کہلاتا ہے۔ روزِ اوّل سے زندگی کا یہی سلسلہ چلا آرہا ہے کہ زندگی کا آخری مرحلہ موت ہے۔ اِس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ زندگی کا آخری حصہ ہے۔ ہم کشاں کشاں اُس کی طرف سفر کرتے رہتے ہیں۔ ہم خود ہی اُس کے پاس پہنچتے ہیں۔ زندگی کے اِمکانات تلاش کرتے کرتے ہم اُس بند گلی تک آجاتے ہیں جہاں سے مڑنا ممکن نہیں ہوتا۔ آگے راستہ بند ہوتا ہے۔ ہم گھبرا جاتے ہیں اور پھر ہم شور مچاتے مچاتے خاموش ہو جاتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!

موت نہ ہو تو شاید زندگی ایک طویل اَلمیہ بن جائے۔ ایک طویل دورانیے کا بے ربط ڈراما، کہ ٹی وی چلتا رہے اور لوگ بور ہو کر سو جانا پسند کریں۔ کہتے ہیں کہ ایک لافانی دیوی کو ایک جوان اور خوبصورت لیکن فانی انسان سے محبّت ہو گئی۔ اُس نے غلطی کو محسوس کیا کہ یہ تو فانی انسان ہے، مر جائے گا۔ وہ دیوتاؤں کے عظیم سردار کے پاس گئی کہ اے عظیم دیوتا! میرے محبوب کو لافانی بنا دو — دیوتا نے کہا، یہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کو موت کا حق دار بنایا جا چکا ہے۔ دیوی نے اِصرار کیا۔ فیصلہ ہو گیا کہ اسے موت نہیں آئے گی۔ دیوی خوش ہو گئی۔ وقت گزرتا گیا۔ بڑھاپا آیا — خوبصورت چہرے پر جھریاں نظر آنے لگیں — توانائی، کمزوری کی زد میں آگئی۔ وقت گزرتا گیا۔ بینائی رخصت ہو گئی۔ سماعت بند ہو گئی۔ یادداشت ختم سی ہو گئی۔ مضمحل ہو گئے قواء سارے۔ وہ انسان چِلّایا: "اے دیوی! خدا کے لیے مجھے نجات دلائیں۔ اِس عذاب کو برداشت نہیں کر سکتا"۔ دیوی نے اپنی دوسری غلطی کو بھی محسوس کیا۔ پھر حاضر ہوئی، دیوتاؤں کے عظیم سردار کے پاس کہ "اے دیوتاؤں کے بادشاہ! — میرے محبوب کو موت عطا کرو۔ اِنسان کو اِنسان کا انجام دے دو"۔

بس یہی راز ہے کہ اِنسان کو اِنسان کا انجام ہی راس آتا ہے۔ بات سمجھنے کی ہے، گھبرانے کی نہیں۔ مقام غور کا ہے، خوف کا نہیں۔ زندگی صرف عمل ہی نہیں، عرصہ بھی ہے۔ اگر صرف عمل ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا۔ اِس عمل کے لیے ایک وقت بھی مقرر ہو چکا ہے۔ اِس وقت کے اندر اندر ہی سب کچھ ہونا ہے، کیونکہ اِس وقت کے بعد کچھ بھی نہیں ہونا۔ ہمارا ہونا، صرف نہ ہونے تک ہے۔ اگر ہم زندگی کو دینے والے کا عمل مان لیں تو اِس کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ دینے والا ہی زندگی لینے والا ہے۔ ڈر کی کیا بات ہے۔ دِن بنانے والے نے رات بنائی۔ رات بنانے والا یہ دِن طلوع کرتا ہے۔ پہاڑ بنانے والا دَریا بناتا ہے۔ صحرا بنانے والا نخلستان پیدا فرماتا ہے۔ زندگی تخلیق کرنے والا موت کو پیدا فرماتا ہے۔ یہ اُس کے اپنے اعمال ہیں۔ ہم صرف اُس کے عطا کیے ہوئے حال سے گزرنے پر مجبور ہیں۔ اُس نے زندگی اور موت کو صرف اِس لیے پیدا کیا کہ دیکھا جائے کہ کون کیا عمل کرتا ہے۔ اِس کائنات میں کوئی بھی تو ایسا انسان نہیں آیا جو گیا نہ ہو۔ کوئی پیدائش موت سے بچ نہیں سکتی۔ جو کچھ بھی ہے، نہ ہوگا۔ ہر شَے، لاشَے ہو جائے گی، مگر اُس کی اپنی ذات جو ہمیشہ ہمیشہ رہے گی۔

بے مصرف زندگی کی سزا موت کا خوف ہے۔ بامقصد حیات موت سے بے نیاز، موت کے خوف سے آزاد، اپنے مقصد کے حصول میں مصروف رہتی ہے۔ عظیم انسان بھی مرتے ہیں، لیکن اُن کی موت اُن کی عظمت میں اضافہ بھی کرتی ہے۔ موت اِنسان سے اُس کی بلند نگاہی، بلند خیالی، بلند ہمتی چھین نہیں سکتی۔ وہ لوگ موت کے سائے میں زندگی کے ترانے گاتے ہیں۔ زندگی کا نغمہ الاپتے ہیں۔ زندگی کے اِس مختصر عرصے میں جو اں ہمت آسمانوں کو چھو آئے — عالی مرتبت عرش کی بلندیاں سر کر آئے اور کم حوصلہ اپنے اندیشوں کے خول سے باہر نہ نکلے۔ موت فانی زندگی کو دائمی حیات میں بدل دیتی ہے۔ فنا سے بقا کا سفر موت کے گھوڑے کی پشت پر ہوتا ہے۔ موت کے لیے تیار رہو۔ موت کا خوف نہ کرو۔

موت کا خوف اس لیے ہوتا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے عزیزوں سے جدا ہو

جائیں گے۔ عزیزوں کو تو ہم زندگی میں ہی جدا کر دیتے ہیں۔ بیٹیوں کی رخصتی کے لیے کتنی دُعائیں کرتے ہیں! ہم صاحبِ تاثیر اُسی بزرگ کو کہتے ہیں جو ہماری بیٹیوں کو رخصت کرا دے —اور صاحبانِ تاثیر ہیں کہ جدائیوں کے لیے دُعا بھی نہیں کرتے، کیونکہ جدائی تو آخر ہو ہی جانی ہے۔ ایک آدمی کا باپ فوت ہو گیا۔ وہ بڑا رویا۔ بڑا پریشان ہوا—موت نے بڑا ظلم کیا۔ اُسے چین نہ آیا۔ اُس کے گرو نے کہا: ”تم اِتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔ کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے، تم بھی اپنے باپ کے پاس پہنچا دیے جاؤ گے“۔ بس یہی ہے موت کا راز، یا زندگی کا راز، کہ ہم کچھ عرصہ اپنی اولاد کے پاس رہتے ہیں اور پھر اپنے ماں باپ سے جا ملتے ہیں۔ ڈر کس بات کا!

عاجزی

اِنسان بے بس ہے۔ بے بسی یہ ہے کہ وہ اِنسان ہے۔ اِنسان اپنے آپ میں، اپنی تخلیق میں، اپنی فطرت میں، اپنی اِستعداد میں، اپنے اعضاء وجوارح میں، اپنے قواء میں، اپنے ظاہر اور اپنے باطن میں، اپنے حاصل اور اپنی محرومی میں، اپنی خوشی اور اپنے غم میں، اپنے اِرادوں اور اپنی تمناؤں میں، اپنے مشاغل اور اپنی مصروفیتوں میں، اپنے احباب و اغیار میں، غرضیکہ اپنی تمام حرکات وسکنات میں عاجزوناتواں ہے —!

انسان کا ہونا اُس کے نہ ہونے تک ہے۔ اُس کا حاصل لا حاصل تک — اُس کی آرزوئیں شکستِ آرزو تک، خونِ آرزو تک — اُس کی توانائی وصحت، بیماری تک اور اُس کی ساری تگ و تاز اُس کے اپنے مرقد تک، اُس کی بلند پروازی اُس کی واپسی تک — اُس کا ہر تخیل، عروجِ خیال، اُس کے زوال تک ہی ہے — اُس کی اَنا ایک بچّے کے غبارے کی طرح پھولتی ہے اور پھر غبارہ پھٹ جاتا ہے اور وہ عاجز و بے بس ہو کر اِس کھیل سے محروم ہو جاتا ہے۔ اِنسان علم حاصل کرتا ہے۔ خود کو دَوام بخشنے کے لیے وہ لائبریریوں میں داخل ہوتا ہے — اُس کے پاس گنتی کے ایّام ہیں اور کتابیں اَن گنت — اُس کا معلوم محدود رہتا ہے اور لا معلوم لا محدود — وہ تیزی سے علوم چاٹتا ہے اور فنا اُس کی زندگی کو چاٹتی ہے — اور انجامِ کار اُس کا انجام — مکمل بے بسی، مکمل عاجزی!

اِنسان عروج چاہتا ہے — بلندی چاہتا ہے — پہاڑ کی چوٹی — اُس پر ایک اور پہاڑ رکھتا ہے۔ اُس کی چوٹی پر ایک اور پہاڑ رکھتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چلتے چلتے اُس وقت تک آ پہنچتا ہے

جب اُس کے سَر کیے ہوئے سب پہاڑ، سب چوٹیاں دھڑام سے زمیں بوس ہو جاتی ہیں——وہ افسوس کرتا ہے تو اُس کے پاس افسوس کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ سوچتا ہے اور سوچ کر عاجز ہو جاتا ہے کہ اُس نے کیا چاہا——اُس نے کیا سوچا——اُس نے کیا پایا——اُس کے ہاتھ آنے والی ہر چیز اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور وہ اپنے حاصل سے نکل جانے پر مجبور ہو جاتا ہے——!

وہ مکان بناتا ہے——خوب صورت، دیدہ زیب، آسائش و زیبائش والا مکان——اُس کا اپنا مکان، اُس کے حُسنِ خیال کا شہکار——اُس کا مکان خوشیوں سے جگمگاتا ہے——اور پھر یہی عشرت کدہ ماتم کدہ بننا شروع ہوتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اُس نے کیا بنایا——اُس کا افتخار انجامِ کار بے بسی میں خاموش ہو جاتا ہے۔

اِنسان صحت کی حفاظت کرتا ہے۔ خوراک کا اہتمام کرتا ہے۔ بڑے جتن کرتا ہے۔ وہ طویل عمر چاہتا ہے اور طویل عمر نقصِ عمر سے دوچار ہوتی ہے——زندگی قائم بھی رہے تو بینائی قائم نہیں رہتی۔ سماعت ختم ہو جاتی ہے——اور پھر یادداشت کسی صدمے کا شکار ہو جاتی ہے——وہ زندہ رہتا ہے، زندگی کے لطف سے محروم——وہ نہ بھی مرے تو اُس کے عزیز، اُس کے اقرباء، اُس کے محبوب رخصت ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی میں خود کو اپنی نظروں میں بیگانہ سمجھنے لگتا ہے——اُس کے پاس اُس کی یادوں کا کوئی شریک نہیں رہتا اور پھر یہ یادیں بھول جاتی ہیں——اُس کی پھیلی ہوئی کائنات سمٹ جاتی ہے۔ وہ ہجوم میں تنہا ہو جاتا ہے۔ اُس کا سب غرور عاجز و بے بس ہو جاتا ہے۔ اُس کا اپنا مکان اُسے نکال باہر کر دیتا ہے——اور کچھ عرصہ بعد اُس کی تصویریں دیواروں اور البموں سے ہٹالی جاتی ہیں——اور کسی کو یاد نہیں رہتا کہ وہ تھا——تھا بھی کہ نہیں——!

اِنسان سفر کرتا ہے۔ فاصلے طے کرتا ہے۔ محدود زندگی میں لامحدود فاصلے کیسے طے ہوں۔ زمین و آسمان کا عظیم سلسلہ فاصلوں سے بھرا ہوا ہے۔ فاصلے ہی فاصلے ہیں، راستے ہی راستے ہیں، مسافرت ہی مسافرت ہے۔ لاکھوں میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چلنے والی روشنی یہ

فاصلے کروڑوں سال میں طے نہیں کر سکتی، اِنسان کیسے طے کرے گا—اِنسان کے پاس عاجزی اور بے بسی کے سِوا کچھ نہیں رہ جاتا!

اِنسان دولت اِکٹھی کرتا ہے۔ مال جمع کرتا ہے۔ اُسے گنتا ہے، گن کر خوش ہوتا ہے۔ فخر کرتا ہے کہ اُس کے پاس مال ہے۔ اُسے جب معلوم ہوتا ہے کہ اِس دُنیا میں کتنے قارون اور فرعون گزر گئے—مال نے کسی کی مدد نہ کی—زمین میں اِتنا مال ہے کہ بس خدا کی پناہ—کوئی کیا حاصل کرے گا—ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھنے سے اِنسان کو کیا ملے گا—اُس کے بینک بھرے رہتے ہیں اور دِل خالی رہتا ہے۔ متاعِ حیات قلیل ہے۔ جوں جوں مال بڑھتا ہے، مال کی تمنّا بھی بڑھتی ہے اور اِنسان اپنی دولت کو ضرورت سے کم سمجھتا ہے۔ وہ اپنی امیری کو غریبی کے ڈر سے بچا نہیں سکتا۔ اگر خواہش حاصل سے زیادہ ہو تو انسان خود کو غریب سمجھتا ہے۔ خواہشات کا بے ہنگم پھیلاؤ آخر کار اِنسان کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنے ہی جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ خواہشات بدلتی رہتی ہیں، مرتی رہتی ہیں، پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اِس کھیل کا نتیجہ، لازمی نتیجہ بے بسی ہے، عاجزی ہے۔ اِنسان کو اُس کی تمنّائیں عاجز کر دیتی ہیں۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر نئی شے کی محبّت میں گرفتار ہونا اُس کا مقدّر ہے۔ نئے مکان، نئے ماڈل، نئے تقاضے پورے کرتے کرتے اِنسان، پُرانا اِنسان، بے بس و عاجز ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ انجامِ کار دیکھتا ہے کہ اُس کا پھیلاؤ سمٹ گیا۔ اُس کی دُنیا محدود ہو گئی۔ اُس کے راستے مسدود ہو گئے۔ اُس کے اِرادے ٹوٹ گئے۔ اُس کی سکیمیں نامکمل رہیں۔ اُس کے پروگرام ادھورے رہ گئے۔ اُس کے خواب پریشاں ہو گئے۔ اُس کے خیال کے اُڑن کھٹولے ہچکولے کھاتے ہوئے زمین پر آ گرے۔ زندگی میں اِتنی مہلت نہیں ملتی کہ اِنسان اس کو دوبارہ شروع کر سکے۔ جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ ہونی، انہونی نہیں ہو سکتی۔ غرور سرنگوں ہو جاتا ہے—زور، کم زور ہو جاتے ہیں اور محنتیں مٹی میں مل جاتی ہیں—!

عجب حال ہے۔ اِنسان کے مزاج میں غرور ہے اور اُس کے مقدّر میں عاجزی—لکھنے

والے نے ایسے ہی لکھا ہے۔ غرور کا یہ عالَم ہے کہ اِنسان خدا بننے کا بھی دعویٰ کرتا ہے۔ وہ سب کچھ بنتا ہے۔ عاجزی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو بے وقوف بناتے بناتے خود بے وقوف بن جاتا ہے۔

اِنسان اپنے مرتبے کو ذریعۂ اِفتخار بناتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا افسر ہو کر شاید بڑا اِنسان ہو جائے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم اِنسان اپنے مرتبوں کی وجہ سے نہیں پہچانے گئے۔ اُن کا کردار اُنہیں عظیم بناتا ہے۔ کردار میں غرور کو سب سے بُرا کہا گیا ہے۔

اللہ کا ارشاد ہے کہ اے اِنسان! تجھے کس بات نے اِتنا مغرور کر رکھا ہے کہ اپنے ربِّ کریم کو بھول گیا۔ کیا تُو نہیں جانتا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب اِنسانوں کو مالک کے رُوبرو پیش کیا جائے گا۔

اِنسان، اور خاص طور پر آج کا اِنسان، ایک سطحی اور نقلی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اندر سے ٹوٹ چکا ہے۔ اُس کو عجیب قسم کے خدشات نے گھیر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ سے، اپنے مستقبل سے مایوس سا ہو چکا ہے۔ وہ اپنے لبادے سے باہر نہیں نکلتا۔ اُس نے صرف اپنے آپ کو خود سے چھپا رکھا ہے۔ وہ اپنی کامرانیوں کا اعلان کر کے دوسروں کو دھوکا دیتا ہے اور اصل میں خود دھوکا کھا جاتا ہے۔ اُس کا غرور ہی اُس کی بے بسی کا اعلان ہے۔ وہ جتنا عاجز محسوس کرتا ہے خود کو، اُتنا ہی خود کو قوی بتاتا ہے۔

اُس کا اِرتقاء، اُس کی ترقّی، اُس کی ترقّی پسندی اُس کی خود گریزی کے اَبواب ہیں۔ وہ اِتنا مصروف رہتا ہے کہ اُس کے پاس اپنے لیے، اپنے وطن کے لیے فرصت نہیں۔ وہ ایک ایکٹر کی طرح زندگی کے سٹیج پر آتا ہے، بڑے بڑے مکالمے بولتا ہے، لوگوں کو متأثر کرتا ہے اور دوسروں کے لیے سٹیج خالی کر کے اپنی بے بس تنہائی میں چلا جاتا ہے۔

اِنسان کے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں، اِس کا علم تو اِنسان کے خالق کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔ اِنسان کو عقل عطا کرنے والی ذات عقل کے صحیح استعمال کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہے۔ خالق انسان سے تدبّر اور تفکر چاہتا ہے۔ وہ اِنسان سے کہتا ہے کہ اے آنکھوں والے

اِنسان! دُنیا کی سیر کر اور دیکھ اُن لوگوں کی عبرت جو جھوٹے تھے، دیکھ اُن لوگوں کا انجام جو مغرور تھے، دیکھ اُن کی عاقبت جو خدا فراموش رہے، دیکھ اُن لوگوں کا حسرت بھرا حاصل جو باغی تھے، دیکھ کہ وہ کس طرح ایک عذاب کی لپیٹ میں آ گئے۔

خالق چاہتا ہے کہ اِنسان غور کرے۔ اِتنا غور کرے کہ وہ اپنی ہستی کا راز دریافت کرے۔ اِنسان کو دعوت ہے کہ وہ غور کرے کہ اِتنے بڑے پہاڑ کیسے معرضِ وجود میں آ گئے۔ اِتنے گہرے سمندر، اِتنے وسیع صحرا، اِتنے بلند آسمان بغیر ستونوں کے، اِتنے لامحدود ستارے اور سیارے، یہ منور سورج، یہ نورانی چاند تخلیق کے اِتنے دِلکش مظاہر کس نے بنائے۔ اُس صانعِ حقیقی کے سامنے تیری صنعتوں کی کیا وقعت ہے۔ تجھے تیری لاعلمی ہی مغرور بنا رہی ہے۔ ورنہ تیرے لیے عاجزی کے علاوہ کیا رکھا ہے۔ اِنسان کو غور کرنے کی دعوت ہے۔ اتنی وسیع کائنات بنانے والے نے ایٹم کے باطن میں قوت پنہاں کر رکھی ہے، مچھر مکھی بنانے والے نے اِنسان کو بتا دیا ہے کہ تخلیق کے کرشمے اِنسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ صرف اونٹ کی تخلیق پر غور کرنے سے اِنسان پر کتنے ہی راز آشکار ہو سکتے ہیں لیکن اِنسان کے پاس فرصت نہیں۔ وہ بے چارہ اپنے پروگراموں میں اُلجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے وجود کی موجودگی کا اعلان چاہتا ہے۔ وہ دوسرے اِنسانوں پر فوقیت چاہتا ہے اور یہی اُس کی بدنصیبی ہے۔ وہ لوگوں کو اپنے سامنے جھکانا چاہتا ہے اور یہی اُس کی بدبختی ہے۔ وہ لوگوں میں اپنی تعریف اپنی زبان سے کرتا ہے اور یہی اُس کی بدتعریفی ہے۔ وہ لوگوں میں بلند ہونا چاہتا ہے اور یہی اُس کی پستی ہے۔ وہ دولت کو ذریعۂ اِفتخار سمجھتا ہے اور یہی اُس کی غریبی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ زمین پر اِترا کر چلنے والوں کا حشر کیا ہوا، اور حشر کیا ہو گا۔

فطرت نے اِنسان کو تخلیق کیا۔ اِنسان خود ہی فطرت کا سرمایہ ہے۔ وہ خود ہی کسی کی ذمہ داری ہے۔ وہ خود ہی کسی فنکار کا شہکار ہے۔ وہ اپنے آپ کو اگر فطرت سے ہی متعلق رکھے تو اُس کی فلاح ہے۔ وہ اگر اسی حاصل پر مطمئن رہے جو فطرت نے اُس کے لیے تجویز کیا ہے تو

اُس کی سعادت ہے۔ وہ تو فطرت سے تعلق توڑ کر کچھ اور بننا چاہتا ہے۔ یہی اُس کی نامرادی کا سبب ہے۔ وہ خود کو مانتا ہے اور مغرور ہو جاتا ہے۔ وہ اگر خدا کو مانے تو عاجزی میں اُس کی نجات ہے۔ اُس کی سب قدرتیں قدرت کی عطا ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو اِستعمال تو کرے، غرور نہ کرے۔ اِنسان اپنی ہستی کو خالق کا احسان سمجھ کر قبول کرے تو اُس کی سلامتی ہے۔ کسی کے احسان کو اپنا استحقاق نہ بنائے تو غرور نہ پیدا ہو گا۔ اُس کا ہر حاصل عطا ہے اور اُس کا ہر دعویٰ خطا ہے۔ سوائے ایک دعویٰ کے کہ وہ ناتوان و بے بس و عاجز ہے۔ تکبر خالق کو، مالک کو زیب دیتا ہے۔ مخلوق اور مملوک کے لیے عاجزی و انکساری ہی باعثِ رحمت و برکت ہے!!!

لب پہ آسکتا نہیں

آنکھ سے گزرنے والا ہر جلوہ بیان میں نہیں آسکتا۔ جب آنکھ محوِ نظارہ ہو تو بیان ممکن ہی نہیں ہوتا اور جب نظارہ رخصت ہو جائے تو صحتِ بیان مشکوک سی ہو جاتی ہے، اور بیان اپنی صداقت کے باوجود یقین اور بداعتمادی کے ملے جلے جذبات پیدا کرتا ہے۔ ویسے بھی دیکھے ہوئے اور سُنے ہوئے منظر میں فرق رہتا ہے۔

آنکھ اگر آنے والے دَور کو دیکھے تو اُس کا بیان سامعین کے لیے اُلجھاؤ کا باعث ہو سکتا ہے۔ آنے والے زمانے کو کس نے دیکھا؟ سچ ہے۔ آنے والا تو غائب ہے اور غائب اگر نظر میں ہو، تب بھی محلِّ نظر ہے۔

آنے والے ایّام آخر جانے والے ایّام سے ہی تو جنم لیتے ہیں۔ اگر حال کو غور سے دیکھا جائے تو اِستقبال کو قبل اَز وقت دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی بوڑھا شخص بیمار رہنے لگ جائے تو مستقبل اِتنا غائب بھی نہیں رہتا کہ اُسے دیکھا نہ جا سکے۔

اگر خرچ آمدن سے بڑھتا جائے تو مستقبل کا اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا۔

اگر جوانوں میں ہیروئن کا شوق اور عادت پیدا ہو جائے تو قوم کا مستقبل صاف ظاہر ہے۔

اگر طالبِ علم، علم کا طالب نہ رہے تو نتیجہ واضح ہے۔

اگر قافلہ کسی کو سالار ہی نہ مانے تو سفر گمراہی کی دلیل ہے۔ قافلے کی منزل وقت سے پہلے عیاں ہے۔

اگر میاں بیوی کے درمیان اَنا کے مقابلے اور مناظرے شروع ہو جائیں تو اُس گھر اور گھر کے افراد کا حشر غائب کا علم نہیں کہلاتا۔

اگر خوراک میں ملاوٹ شروع ہو جائے تو صحت کے بارے میں سیمینار منعقد کرنا بے کار ہے۔ صحت کا علم وقت سے پہلے معلوم ہو سکتا ہے۔

اگر رشوت لینے والے محفوظ مرتبوں پر فائز ہوں تو مستقبل — کیسا مستقبل!

اگر چوکیدار ہی چوری کرنے لگ جائیں، اگر باڑ ہی کھیت کو کھانے لگ جائے، اگر ایمپائر ہی غیر جانبدار نہ رہیں تو مستقبل عیاں ہوتا ہے۔

اگر کسی کو کسی پر اعتماد نہ ہو، اگر کوئی کسی کے لیے بے ضرر نہ ہو، اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص پر، اُس کی نیّت پر شبہ ہو، اگر اِنسان اپنے آپ سے بیزار ہو، اگر الفاظ اپنے معنی سے جدا ہو جائیں تو مستقبل کے بارے میں جاننا غیب کی بات نہیں، ظاہر کا علم ہے۔ اگر سیاست اختلاف برائے اختلاف پر مبنی ہو تو سیاسی استحکام کا مستقبل آشکار سا ہو جاتا ہے۔ یہ سب باتیں اور اِسی طرح کی کئی باتیں، ظاہر ہے ہر ذی شعور کے لیے اپنے اندر آنے والے زمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔

کبھی کبھی حالاتِ حاضرہ کے مشاہدے کے بغیر بھی مستقبل اپنے آنے کی قبل اَز وقت اطلاع دیتا ہے۔ اِقبالؔ نے اگر کہا ہے کہ ”محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی“ تو اِس خبر کا تعلق حال سے قطعاً نہیں، یہ الگ اِطلاع ہے۔ اِس کا تعلق نظر سے ہے۔

مقامِ خبر اور مقامِ نظر کا فرق تو صرف اہلِ باطن ہی معلوم کر سکتے ہیں۔ اہلِ باطن کی نظر میں اپنے زمانے کے علاوہ بھی زمانے ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وجوہات اور نتائج کے رِشتے اِنسانی رِشتوں کی طرح ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ بعض اوقات وجہ کچھ اور ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ اور!

بے سبب نتائج کی خبر ہی نظر کہلاتی ہے۔ صاحبِ نظر نقیبِ فطرت ہوتا ہے۔ فطرت اُسے جو کچھ دکھاتی ہے، وہ اُسے بیان کرتا ہے۔ وہ صاف صاف بیان کرتا ہے، لیکن سُننے

والے سمجھ نہیں سکتے۔ سامعین حیران ہوتے ہیں کہ اُس نے کون سا اخبار پڑھ لیا ہے۔ یہ شخص بہک تو نہیں گیا، لیکن نہیں۔ وہ بہکتا نہیں۔ فطرت بہکنے والوں کے ذریعہ سے کوئی پیغام نہیں بھیجتی۔ یوں بھی جاننے والوں اور نہ جاننے والوں میں فرق رہتا ہے، اُسی طرح جس طرح جاگنے والوں اور سونے والوں میں فرق ہے۔

ہر دَور میں جاننے والوں نے نہ جاننے والوں کو اپنے علم سے متعارف کرایا ہے۔ سُننے والوں کو یقین آئے نہ آئے، یہ الگ بات ہے۔ فی الحال اِس سے بحث نہیں۔ یقین اگر اہلِ نظر کی بات کی تصدیق سے پہلے آئے تو بہتر، ورنہ بے کار۔ اگر حادثہ گزر جائے تو یقین کا فائدہ ہی کیا؟ مثلاً اگر کوئی بتانے والا یہ بتائے کہ سانپ آرہا ہے تو اِس سے پہلے کہ بتانے والے کی تحقیق کی جائے، بہتر یہی ہے کہ سانپ کا تدارک کر لیا جائے۔ پھر دیکھا جائے کہ خبر صحیح تھی یا غلط — دونوں حالتوں میں ہم محفوظ رہتے ہیں!

اگر ہم مسلمانانِ پاکستان اپنی حالت کا مسلمانانِ عالم کے پس منظر میں جائزہ لیں تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ آیئے غور کریں کہ دُنیا کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان کس حال میں ہیں؟ وطن میں غریب الوطن!

ایران کس حال سے گزر گیا؟ عراق کس حال میں ہے اور ہمارا پڑوسی مسلمان افغانستان کس صورتِ حال سے دوچار ہے؟ لبنان، فلسطینی مسلمان، افریقہ کے مسلمان، سب پر کیا مسلط ہے؟ ہمیں اپنی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ ہم ایک خطّۂ امن بنے ہوئے ہیں — ہم گوشۂ عافیت میں ہیں — سوال یہ ہے کہ کیوں اور کب تک؟

ہم میں کیا خصوصیت ہے؟ کیا ہم بہت ہی لاڈلے ہیں؟ ہماری حالت باقی مسلمانوں کی حالت سے مختلف کیوں ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری باری آنے والی ہو اور ہم بے خبر اپنے حال میں مگن ہوں — بس یہی ہے وہ خبر، جسے نظر کہا جاسکتا ہے!!

اب ہمارا عمل بدلنا چاہیے، ورنہ ہم بھی کسی ناخوشگوار واقعہ کی نذر ہو سکتے ہیں۔ دُنیا میں زلزلے آرہے ہیں اور ہم بھی دنیا میں رہتے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو، لیکن ایسے ہو تو

سکتا ہے۔ خدانخواستہ کسی ڈیم کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں — خدا نہ کرے ایسا ہو — لیکن ایسے ہو تو سکتا ہے۔

خدا نہ کرے کہ کوئی جنگ ہو۔ لیکن ہر روز کی خبریں، بار بار جنگ کے اِمکانات کا ذِکر — جھوٹ ہو، اللہ کرے — لیکن اگر سچ ہو تو؟ اندرونی خلفشار طاقت نے دبا رکھا ہے۔ اگر خدا نہ کرے کوئی لاوا اُبل پڑے — تو — کیا ہو گا؟

ہماری سرحدوں کی حالت تشویشناک نہیں، لیکن تسلّی بخش بھی تو نہیں۔ ایسی حالت میں کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ کرے کہ ایسا نہ ہو لیکن ہو تو سکتا ہے!

اِسلام کے حوالے سے افغانستان ہم سے کم مسلمان نہیں اور طاقت کے لحاظ سے ہم کسی دشمن سے زیادہ نہیں۔ نتیجہ کچھ بھی تو ہو سکتا ہے!

آنے والا زمانہ جانے والے زمانے سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ غور کیا جائے — اگر ہمارے ساتھ خدانخواستہ کوئی ایسا ویسا واقعہ یا حادثہ ہو گیا، تو ہمارے لیے جائے مَفر نہیں۔ ہم ہر طرف سے محصور ہیں۔

ہمیں اپنے دامن میں کوئی ایسا کام بھی تو نظر نہیں آتا جس سے ہم کسی ناگہانی سے محفوظ رہنے کا حق حاصل کریں۔ ہمیں اللہ پر بھروسہ ہے اور اللہ سب مسلمانوں کا بھی تو اللہ ہے۔ اب مستقبل کا دارومدار صرف اخوّت پر ہی ہو سکتا ہے اور شومئ قسمت کہ ہم میں اخوّت ہی تو نہیں۔

ہمیں صرف گفتگو، لائحۂ عمل، صرف بیانات سے آگے نکلنا چاہیے۔ ہمیں علم سے نکل کر عمل کے میدان میں اُترنا چاہیے۔ وحدتِ عمل، وحدتِ کردار — یہی اور صرف یہی ہمارے لیے راہِ نجات ہے۔

شاعرِ ملتِ اسلامیہ اقبالؔ نے جب یہ کہا کہ

ع وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے

تو اِس کا مخاطب کوئی بھی زمانہ ہو سکتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ ہمارا ہی زمانہ ہو۔ اہلِ نظر شاعر کی نگاہ سے زمان و مکاں کے حجابات اُٹھ چکے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے زمانے سے کسی بھی زمانے کو کوئی

سا پیغام دے سکتا ہے۔ اقبالؔ دیکھ رہا تھا، آنے والوں کو — جانے والوں کو — اقبالؔ کی زبان سے بولنے والی کوئی بھی ذات ہو سکتی ہے۔ اقبالؔ خود کہتا ہے:

ع نکلی تو لبِ اقبالؔ سے ہے، کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا

تو — غور کا مقام ہے — بڑے غور کا مقام ہے۔

ہمارے اندیشے اتنے بے سبب بھی نہیں۔ آنے والا دَور اِتنا خوشگوار بھی نہیں کہ ہم غفلت میں ہی اُس کا اِنتظار کریں۔ ہو سکتا ہے — اور بہت کچھ ہو سکتا ہے!!!

اگر اینٹوں میں وحدت نہ رہے تو دیوار اپنے بوجھ سے گِر بھی سکتی ہے۔

تقریریں، مذہبی اور سیاسی، صرف تقریریں، صرف خطابات، بیانات اور صرف الفاظ سے قوم کی تاریخ مستحکم نہیں ہُوا کرتی۔ قومیں عملِ پیہم سے بنتی ہیں۔ ہمارا قومی عمل کیا ہے؟ ہم جس درخت کے سائے میں بیٹھے ہیں، جس کا پھل کھا رہے ہیں، اُسی درخت کی قدر نہیں کرتے۔ اُس کی حفاظت کے لیے متحد نہیں ہوتے۔ ہم کیا کرتے ہیں؟

اگر سورج کی کرنیں سورج ہی کو چاٹ لیں تو کیا ہو گا؟ اگر الفاظ کی بے معنی کثرت الفاظ کی حُرمت ختم کر دے تو کیا ہو گا؟ اگر مساجد کی تعداد بڑھ جائے اور نمازیوں کی تعداد کم ہو جائے تو کیا ہو گا؟

اگر قوم میں قوّتِ بازو بھی نہ ہو اور قوّتِ ایمان بھی نہ ہو تو کیا ہو گا؟

اگر آدھا راستہ طے کرنے کے بعد مسافر بددل ہو جائیں تو کیا ہو گا؟ — آگے جانے کا عزم نہ رہے اور پیچھے کو لوٹنا ممکن نہ ہو تو کیا ہو گا؟

اگر زمین پر گناہوں کا بوجھ بڑھ جائے، اگر مکان اپنے مکینوں سے نالاں ہوں — اگر اِنسانوں کا اپنا باطن اُن کے اپنے ظاہر سے پریشان ہو — تو کیا ہو گا؟

اگر ہمیں یہود سے توقع ہو کہ وہ ہنود کے مقابلے میں ہمیں ترجیح دیں گے، تو کیا ہو گا؟

اگر شاعر، ادیب، دانشور، نظریاتی سرحدوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں تو ملکی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کون کرے گا؟

اگر ہم آپس میں مہربان نہ ہوں تو دُشمن کے مقابلے میں متحد کیسے ہوں گے؟

اگر بِلّی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کرلے—تو کیا ہوگا؟ اگر سچّے دِین کی تبلیغ کرنے والے خود سچّے نہ ہوں تو تبلیغ کی تاثیر کیا ہوگی؟

اگر غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کا ذکر کرنے والے اپنے نوکروں کے ساتھ بدسلوکی کریں—تو نتیجہ کیا ہوگا؟

اگر غفلت، خوش فہمی اور خوش اعتمادی کی وجہ سے ایک دفعہ ملک ٹُوٹ چکا ہو اور قوم کے مزاج اور عمل میں فرق نہ آیا ہو—تو غور کا مقام ہے۔

اگر—اور یہ بہت بڑا "اگر" ہے—کہ اگر دِین خوشنودیٔ رسول ﷺ اور خوشنودیٔ خدا کا نام ہو، اور خدا اور مصطفیٰ ﷺ ہم پر راضی نہ ہوں—تو—ہم کِدھر جائیں گے؟

اب اِس مقام پر کسی پیش گوئی اور کسی بحث کے تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ اِبتلا کا وقت ہے۔

کیا ہم غور کرنے کی تکلیف گوارا کرسکتے ہیں؟

کیا ہم ماضی سے سبق حاصل کرسکتے ہیں؟

کیا ہم دوسرے مسلمان ممالک سے سبق حاصل کرسکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے کو معاف کرسکتے ہیں؟

کیا ہم ایک دوسرے سے معافی مانگ سکتے ہیں؟

کیا ہم حق بات کہنے کی جرأت کرسکتے ہیں؟

کیا مشائخِ کرام واقعی متحد ہوسکتے ہیں؟

کیا علماء ایک مسلک پر متفق ہوسکتے ہیں؟

کیا سیاست دان سچ اور صرف سچ بول سکتے ہیں؟

کیا طاقت خوف کے بجائے محبّت پیدا کرسکتی ہے؟

کیا آج کے بچوں کو آنے والے زمانوں کے خوشگوار ہونے کی گارنٹی دی جاسکتی ہے؟

کیا آئندہ کسی ٹوٹ پھوٹ کے نہ ہونے کا یقین ہو سکتا ہے؟

کیا ہم پُرانے زخموں کے لیے مرہم تیار کر رہے ہیں یا کسی نئے زخم کا انتظار کر رہے ہیں؟

اِس سے پہلے کہ ہم پر رحمت اور توبہ کے دروازے بند ہوں، کیا ہم اپنی فکر اور زندگی کو بدل سکتے ہیں؟

کیا ہم دُشمن کی چال سے بے خبر ہیں—؟ دُشمن کی اصل قوّت دوستوں کی جدائی میں ہے۔

کیا ہم اتنا اِسلام بھی نہیں رکھتے، جتنا قائدِاعظمؒ کے پاس تھا؟ اُس صاحبِ ایمان کے پاس صرف صداقت تھی، جذبہ تھا، دیانت تھی، خلوص تھا۔ بس یہی کچھ تو تھا۔ اُنھوں نے نہ کسی سے کلمہ سنا، نہ کسی کو قرآن سنایا۔ اُنھوں نے صِرف مسلمانوں کے لیے، اُن کی فلاح کے لیے، اُن کی اپنی حکومت کے لیے، ایک مملکت بنا کر دِکھا دی—اعجاز ہے—اور ہم اِس مملکت میں کیا کیا کر چکے ہیں—کیا کیا کر رہے ہیں۔ ہم یقینا جواب دہ ہیں، شہدائے وطن کے سامنے، شہدائے ملّت کے سامنے، خدا کے سامنے اور پھر حضور ﷺ کے سامنے! بات علم کی نہیں، عمل کی ہے—خالص عمل، اِسلامی عمل، صداقت و دیانت کا عمل، رحمت و محبّت کا عمل۔ ہم سب ایک کشتی میں سوار ہیں، ایک اُمّت ہیں، بحث کی ضرورت نہیں—غور کا مقام ہے—دُعا کی گھڑی ہے—کہ خدا کرے وہ واقعہ ہی ٹل جائے—جس کا ذِکر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ واقعہ ہی ایسا ہے کہ لب پہ آ سکتا نہیں۔

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

اِنسان کی زندگی خواہ کتنی ہی آزاد اور لا تعلق ہو، پابند اور متعلق رہتی ہے۔ اِنسان دوڑتا ہے، لیکن فاصلوں کی حدود میں۔ اِنسان اُڑتا ہے، لیکن خلا کی پہنائیوں کے اندر — وہ ارض و سماوات کے اندر ہی رہتا ہے۔ اِنسان جب کسی طاقت کو نہیں مانتا، وہ اُس وقت بھی اپنے انکار کی طاقت کے ماتحت ہوتا ہے۔ اِنسان کی خوشیاں، تمام تر مسرّتیں کسی نہ کسی غم کی زَد میں ہوتی ہیں۔ ہر غم خوشی بن کر آتا ہے اور ہر خوشی غم بن کر رُخصت ہو جاتی ہے۔ بس خوشیوں نے رُخصت ضرور ہونا ہے۔ پیاری پیاری، اپنی بیٹیوں کی طرح — کیا کیا جائے!

اِنسان شب و روز کے حصار ہی میں جکڑا سا ہُوا ہے۔ وہ صدیوں سے اِس جال کو توڑنا چاہتا ہے۔ زمان و مکاں توڑ کر نکل جانا چاہتا ہے۔ نکل کر کہاں جائے گا — ہم دُنیا سے بھاگ سکتے ہیں، لیکن اپنے آپ سے کون بھاگ سکتا ہے۔ اِنسان اپنے پنجے میں ہے۔ وہ خود گریز بھی ہے، خود پرست و خود مَست بھی ہے، خود گر و خود سر بھی ہے، خود بین و خود کلام ہے، خود نگر ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود شکن ہے۔ اُس کے اپنے وجود میں اُس کے لیے کچھ بھی تو موجود نہیں۔ سب کچھ ہے، لیکن کچھ بھی نہیں۔

اِنسان شاید سمجھتا نہیں کہ وہ اپنی صفات، حیات، اپنی عادات، لذّات، شہوات و حیوانیات، عبادات و اعتقادات کا مرقع ہے۔ اُس پر گردشِ زمان و مکاں کے علاوہ بھی کئی گردشیں گزر جاتی ہیں۔ اُس پر روزگارِ زمانہ کے علاوہ بھی کئی زمانے آتے ہیں — موسمِ بہار کے

علاوہ بھی کئی بہاریں آتی ہیں۔ اُس کے اپنے اندر کبھی پھول کھلتے ہیں، کبھی ببول مسکراتے ہیں۔ اُس کے ساتھ ساتھ روشنی و تیرگی کے اَدوار سفر کرتے ہیں—اُس کا شعور، آزادی کا شعور اُس کا اپنا نہیں— وہ اپنے ماضی سے کٹ نہیں سکتا، اپنے مستقبل سے ہٹ نہیں سکتا—اُس کا حافظہ، اُس کا تخیل اُسے آزادی کا شعور عطا کر کے اُسے پابند کر دیتے ہیں۔

اِنسان اپنے آپ پر غور کرتا ہے۔ اُسے اپنے اندر ایک جہان نظر آتا ہے۔ وہ اپنی بینائی کو دیکھتا ہے۔ لطف اندوز ہوتا ہے نظاروں سے— لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ بینائی دینے والی طاقت نے ہی نظارے پیدا کیے ہیں—اب یہی آزاد نگاہ اُنہی نظاروں کی پابند ہو کر رہ جاتی ہے۔ اِنسان وہ چیز نہیں دیکھ سکتا، جو نہیں ہے— وہی مناظر جو صدیوں سے دیکھے جاتے رہے ہیں، وہی سیّارے و ستارے، وہی شمس و قمر، وہی مشرق و مغرب اور وہی کوہ و صحرا، قلزم و دریا، وہی بادل، وہی فضائیں، وہی ہوائیں، وہی موسم، وہی پُرانے غم اور پُرانی خوشیاں—!

نیا اِنسان نئی بینائی اور نئے عزائم کے ساتھ پُرانے مناظر دیکھتا ہے۔ اُس کے سامنے جو جلوہ موجود ہے، وہ اُس سے پہلے بھی موجود ہے اور اُس کے بعد بھی موجود رہے گا۔ آزاد اور جدید اِنسان نے بڑی پابندی سے پرانے نظارے ہی دیکھنے ہیں۔ نگاہ کی آزادی اپنے اندر ایک حد تک آزاد ہے۔ دیکھنے والا ایک حد کے بعد نہیں دیکھ سکتا۔ یہ حد کبھی فاصلوں کی شکل میں ہے، کبھی عمر کے حساب سے ہے۔ آج کی بینائی شاید کل، آج ہی کی طرح کام نہ آسکے۔ جہاں گلاب کھلتے تھے، وہاں اِن آنکھوں میں موتیا کھلے گا۔ آج کا لطف شاید آئندہ نہ مل سکے—آج کا احساس شاید آج تک ہی ہو— محفل کی گرمیاں تنہائیوں میں یخ ہو جاتی ہیں۔

آج کی حقیقت کل کا افسانہ ہوگی۔ اِنسان آزاد ہے کہ جو چہرہ چاہے، پسند کر لے لیکن اُس نے صرف ایک ہی چہرے سے محبّت کرنا ہے، اور یہاں آزادی آزاد نہیں رہتی۔

اِنسان کے سامنے پھیلی ہوئی کائنات اُس کو بہت ہی وسیع نظر آتی ہے اور اِس کائنات کے اندر اُسے اپنے لیے اِمکانات لامحدود نظر آتے ہیں—اِمکانات لامحدود ہی رہتے ہیں اور

فیصلے بڑے مختصر اور محدود —شادی سے پہلے شادی کے امکانات لامحدود —لیکن فیصلے کے لمحے میں یہ سارے لامحدود اِمکانات ایک مختصر اور محدود فیصلے میں ختم سے ہو جاتے ہیں۔ اِنسان سمجھتا نہیں ہے۔

زندگی کی وسیع شاہراہیں آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی سڑکوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور یہ سڑکیں نہ جانے کیسے بند گلیوں میں بدل جاتی ہیں اور اِمکانات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور پھر وہی اِنسان سمندِ طاغوت سے گرتا ہوا زمین پر آ رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ سب کیا تھا— کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا، لیکن بس یہی کچھ ہُوا۔ اگر یہی کچھ تھا، تو یہی کچھ ہی کیوں تھا— وہ سب کچھ کیا تھا، جو اَب نہیں ہے۔

اپنی قوت پر گھمنڈ کرنے والا اپنے عجز پر شرمندہ تو ہوتا ہے، لیکن اپنی شرمندگی پر مزید عاجز ہوتا ہے۔ اُس کی قوت اپنے اندر ہی دَم توڑ جاتی ہے— قواء تو مضمحل ہو ہی جاتے ہیں۔ عناصر میں اعتدال تو غالؔب کو بھی نہ ملا— کسی کو نہیں— سب کے ساتھ ایسے ہوتا آیا ہے۔ اپنے آپ میں مگن رہنے والا خوش باش بے فکر نوجوان ایک دن اُداس ہو جاتا ہے— اُس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی— صرف اُس کا کوئی بہت ہی قریبی عزیز فوت ہو گیا۔ وہ سوچتا ہے، عجیب بات ہے۔ مرنے والا رخصت کے وقت عجیب تحفہ دے گیا۔ غم دے گیا، خوشی لے گیا۔ اب یہ غم امانت ہے۔ مانگے بغیر ملتی ہے۔ ہماری آزادی کے چار تنکوں پر یہ برقِ آسمانی نازل ضرور ہوتی ہے— ایسے کیوں ہوتا ہے۔ بس یہی تو بے بسی ہے کہ وجوہات و نتائج سے باخبر اِنسان بھی اِس سے بے خبر رہتا ہے کہ آخر آنے والے جاتے کیوں ہیں، اور اگر جانا ہی ہے تو آنا کیوں ہے!

اِنسان کا علم، جدید علم بھی آج کے اخبار کی طرح کل کی خبریں دیتا ہے۔ اِنسان جسے تازہ سمجھ رہا ہے، وہ کُہنہ ہے— یہ جواں سورج بہت ہی بوڑھا ہے— یہ ماہتابی چہرہ صرف دُور سے دیکھنے والا ہے۔ یہ حسین و جمیل و جسیم ستارے، بس اپنی نظر کا دھوکا ہے— بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آگہی بھی فریبِ آگہی سے زیادہ نہیں— اِنسان ایک خاص وقت میں مقرر شدہ لمحے میں پیدا

ہوتا ہے اور پھر ایک اور مقرر شدہ لمحے میں رُخصت ہو جاتا ہے۔ اِن دو نقطوں کے درمیان آزادی کا سفر ہے۔ اِمکانات اور حاصل کا سفر ہے—ساٹھ سال کی طویل عمر میں بیس سال نیند کی نذر ہو جاتے ہیں— مجبوری ہے۔ بچپن اور بڑھاپا اور بیماری کے ایّام نکال دیے جائیں تو اِنسان کے پاس اپنا کیا رہتا ہے۔ اِس پر مستزاد یہ کہ آدھی زندگی بیچ کر باقی کی زندگی کو پالنا ہے۔ دفتروں کی نذر ہونے والی زندگی بِک چکی ہے —اِنسان کے پاس اپنے لیے چند سال رہ جاتے ہیں۔ اِسی مختصر عرصے میں اِنسان نے سب کچھ کرنا ہے۔ بس کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ سفر ختم ہو چلا ہے اور دامنِ مراد خالی ہے۔ وہ پھر دیکھتا ہے۔ اُسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اُس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ خود بھی اپنا نہیں تھا۔ اُسے بھیجنے والے نے اُسے اِسی کام کو بھیجا کہ جاؤ اور پھر آجاؤ—وہ اپنے خالی دامن میں رضا کے پھول بھرتا ہے اور پھر پکار اُٹھتا ہے:

ع اِسی سے فقیری میں ہُوں مَیں اَمیر